معروف مزاح نگاروں کی ہنستی مسکراتی تحریریں

طنز و مزاح

انتخاب: رخسانہ نازلی

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

فہرست

نمبر شمار	مضمون	مصنف	صفحہ نمبر
۱	آگے ولا آدمی	ابن انشاء	۳
۲	نوید طاہر کے نام	ابن انشاء	۶
۳	استاد مرحوم	ابن انشاء	۸
۴	سینر، ماتاہری اور مرزا	مشتاق احمد یوسفی	۱۵
۵	ہم زلف	شوکت تھانوی	۲۶
۶	مِس چنبیلی	کنہیالال کپور	۲۹
۷	شادی گرانی	سید نصرت	۳۴
۸	گشتی عقوبت خانہ	ڈاکٹر محمد محسن	۳۸
۹	کلامِ صنفِ نازک بے اثر!	نیر اعجاز	۴۱
۱۰	ڈیڈی فیل ہو گئے!	عابد معز	۴۴
۱۱	اب کہاں یاری کی ہے وہ رسم وراہ!	الیف۔اے۔انوری	۴۹
۱۲	یوں ہی گر روتا رہا.....!	سید نصرت آرکیٹیکٹ	۵۲
۱۳	برسات کے بعد	مرزا عاصی اختر	۵۷
۱۴	مدہوش مین پوری	مرزا عاصی اختر	۶۱
۱۵	شکم ہے کہ ستم	وحید الرحمٰن خان	۶۴
۱۶	منگل اِشٹکا	راجندر سنگھ بیدی	۶۸
۱۷	ایک چوہے کا پیغام	ابوالفرح ہمایوں	۷۶
۱۸	رانگ نمبر.....	عزیز جبران انصاری	۷۹
۱۹	عورتیں مسکرانا کیا جانیں.....!	ڈاکٹر سیّد صابر علی ہاشمی	۸۱
۲۰	''نگارہائے فتنہ گر''	محمد عبدالقادر تاباںؔ اسلام آباد	۸۳

آگے والا آدمی

معروف مزاح نگار ابن انشاء کا فکر انگیز انشائیہ

میں اس آگے والے آدمی کے ہاتھوں بہت تنگ ہوں میں جس قطار میں بھی کھڑا ہوں یہ صاحب مجھ سے آگے ہوتے ہیں۔ میں بھاگم بھاگ ریلوے اسٹیشن پہنچتا ہوں، مجھے کوئٹہ کی گاڑی پکڑنی ہے اس کے چلنے میں پانچ منٹ باقی ہیں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص مجھ سے پہلے کھڑا بکنگ کلرک سے ہم کلام ہے اور اس نے اپنی کہنیاں کھڑکی کے چھجے پر جما رکھی ہیں اس شخص کو ہفتہ بھر بعد لاڑکانہ جانا اور یہ معلوم کرنا ہے کہ راستے میں کہاں گاڑی بدلی جائے گی۔ صبح سے آدھی رات تک وہاں کون کون سی ریلیں جاتی ہیں ان میں کیا کیا درجے ہیں اور ہر درجے کا کرایہ کتنا ہے۔ آیا گرمیوں کی چھٹیوں میں کوئی رعایت ملتی ہے پوری بارات جانی ہو تو کتنے کا ٹکٹ بنتا ہے۔ اس دوران دوسری کھڑکی کی قطار برابر کھسک رہی ہے لوگ ٹکٹ لے رہے ہیں، جا رہے ہیں میں تنگ آ کر اس کھڑکی کا رخ کرتا ہوں۔ چھ آدمیوں کے بعد میری باری آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تو صرف پلیٹ فارم ملتے ہیں اتنے میں میری گاڑی نکل جاتی ہے۔

جب میں ڈاک خانے جاتا ہوں تو کاؤنٹر پر پہلے سے ایک شخص کئی لفافے اور پیکٹ لئے کھڑا ہوتا ہے اور سب کی منزلیں مختلف ہوتی ہیں، سب کے وزن الگ الگ کرانا ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک پیکٹ جزائر غرب الہند کے کسی جزیرے کا جانا ہے کلرک کو یہ دیکھنے کے لئے اٹھنا پڑتا ہے کہ غرب الہند کہاں واقع ہے پھر وہ کتاب دیکھتا اور بڑے ڈاک خانے فون کرتا ہے وہ لوگ اسے انتظار کرنے کا کہتے ہیں۔ میں دوسری کھڑکی پر جاتا ہوں تو وہاں ایک اور شخص ہے جس کے پاس پچاس روپے کا نوٹ ہے لفافے وہ لے چکا ہے اور اتنے کا کھلا کلرک کے پاس نہیں۔

سینما میں بھی یہی شخص میرے آگے ہوتا ہے اس شو کا آخری ٹکٹ لینے کے لئے، اس کے بعد بکنگ کلرک ''ٹکٹ ختم'' کی تختی لگا دیتا ہے۔

ابھی پرسوں میں بینک گیا رقم نکلوائی تھی وہاں کسی دفتر کا سپرنٹنڈنٹ مجھ سے پہلے موجود تھا وہ سارے دفتر کے لوگوں کے چیک لے آیا تھا کہ ایک ساتھ کیش ہو جائیں اور ہر ایک کو وقت نہ ضائع کرنا پڑے روپے لینے کے بعد اس نے سب کے پراویڈینٹ فنڈوں میں ان کی رقمیں جمع کرائیں سب کا حساب الگ الگ بنایا پھر وہ تین نئے اکاونٹ کھولے۔ اتنے میں ایک بج گیا کلرک نے مجھے کہا:

''صاحب! اب آپ کل نو بجے آیئے۔''

یہی ماجرا دکاندار کے ہاں پیش آتا ہے۔ سڑک پر گاڑی لے کر نکلے تو اپنے سے آگے والا مزے مزے سے سیٹی بجاتا پندرہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی چلاتا ہے اور سڑک خالی بھی نہیں کرتا۔

زیب النساء اسٹریٹ پر مجھے گاڑی کھڑی کرنی ہوتی ہے مگر سب جگہیں بھری پڑی ہیں کوئی خالی نہیں۔ بس ایک جگہ خالی ہے اس میں یہ شخص مجھ سے ایک منٹ پہلے اپنی گاڑی گھسا دیتا ہے اور مجھے پھر چکر کاٹ کر آنا پڑتا ہے۔ اس دوران اس کی بیوی سامنے کی دکان سے کچھ خرید کر

آرہی ہوتی ہے میں اس کی گاڑی کے پیچھے اپنی گاڑی کھڑی کرتا ہوں کہ یہ نکلے تو میں جگہ لوں میرے رکنے سے راستہ رک جاتا ہے اور پیچھے کاروں کی لمبی قطار لگ جاتی ہے۔ وہ شخص اپنی گاڑی چلاتا ہے میری جان میں جان آتی ہے لیکن پھر انجن بند کر دیتا ہے کیونکہ اس کی بیوی خریدی گئی شے لوٹا کر بڑی جسامت میں دوسری چیز لینا چاہتی ہے۔ مجھے پھر دو گلیوں کا چکر کاٹ کر آنا پڑتا ہے اس دوران اس کی جگہ کوئی دوسری کار لے چکی ہوتی ہے۔

مجھے ٹیلی فون کرنا ہے میں ٹیلی فون بوتھ کے باہر ادھر اُدھر چکر کاٹتا ہوں۔ کوئی صاحبہ فون کر رہی ہیں سنا تو کسی کو خدا حافظ کہہ رہی ہیں۔

''اچھا تو اور کیا حال ہے بھئی اس بار کوئی فلم دیکھی؟ کون کون ہے اس میں؟ کہانی کیا ہے؟ تمہاری پھوپھی کے بیٹے کا کیا احوال ہے؟ وہ ولایت گیا کہ نہیں؟ پڑوس سے شمیم کو بلا دو اس سے بھی بات کر لوں.....''

خدا خدا کر کے وہ نکلتی ہیں اور میں اندر داخل ہوتا ہوں، سکہ ڈالتا ہوں لیکن اب نمبر یاد نہیں آرہا ۶۱۰۲۴۴..... ہے یا ۶۱۰۴۲۲ ہے ڈائری دیکھنے پل بھر کے لئے باہر نکلتا ہوں ایک اور خاصی توند یل صاحبہ میرے کھوے سے کھوا چھوتی اندر گھس جاتی ہے ان کے پاس ٹیلی فون نمبروں کی ایک لمبی فہرست ہے اس سکوں کا انبار ہے جسے وہ تختے پر ٹکا دیتی ہیں۔ کل پکنک ہے انھوں نے سب سہیلیوں کا یاد دہانی کرانی ہے نا!

یہی ریستوران میں ہوتا ہے مجھے بھوک لگی ہے اور دو بجے دفتر واپس پہنچنا ہے کوئی میز خالی نہیں ہے ایک صاحب کھانا کھا چکے ہیں لیکن انھوں نے آئس کریم منگوائی ہے میری آنکھیں ان کے چمچے کے ساتھ ساتھ پیالی پر آتی اور پھر منہ تک جاتی ہیں سوچتا ہوں اب ختم ہوئی کہ ہوئی چار چمچ اور ہوں گے۔ میں گھڑی دیکھتا ہوں آخر وہ اپنا چمچہ خالی پلیٹ میں رکھتا اور ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہے پھر بیرے کو بلاتا اور اس کے کان میں کچھ کہتا ہے میں اپنے ایک پاؤں کا بوجھ دوسرے پاؤں پر منتقل کرتا ہوں اتنے میں بیرا نمودار ہوتا اور ایک پیالی اس کی میز پر رکھ دیتا ہے یہ صاحب شام کا اخبار نکالتے اور معمے پر نشان لگانا شروع کر دیتے ہیں کہ چائے ٹھنڈی ہو لے۔

ڈاکٹر کے ہاں وہ مجھ سے پہلے سے موجود ہوتا ہے اور مجھے پورا ایک گھنٹہ اس کی خاطر وہاں بیٹھنا اور چھ ماہ پرانے رسالے پڑھنے پڑتے ہیں۔ ہوائی جہاز کے اندر رات بھر سفر کے بعد ادھر صبح ہوئی اور اس شخص نے شیونگ والا بیگ سنبھالا اور جہاز کے واحد غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ میں اس وقت تک باہر کھڑا رہتا ہوں جب تک یہ شخص اپنی تازہ شیو پر ہاتھ پھیرتا برآمد نہیں ہوتا اتنے میں جہاز زمین پر اترنے کو ہوتا ہے۔ فضائی میزبان کہتی ہے۔

''صاحب! اپنی نشست پر جائیے اور پیٹی باندھیے۔''

میں دانت کچکچا کر رہ جاتا ہوں۔ میرے پیٹ میں غضب کی کلبلاہٹ ہے۔

اور تو اور جب یہ شخص مجھ سے پیچھے ہو تب بھی میں اس سے آگے نہیں نکل سکتا۔ کل عبدالغفور اینڈ سنز کے ہاں سیل لگی ہوئی تھی اس شخص نے میرے پیچھے کھڑے کھڑے سیلز مین کو آواز دی۔ ''بھیا وہ قمیض میرے لئے رکھ لو'' وہ میرے پسندیدہ رنگ اور ڈیزائن کی آخری قمیض تھی۔

لفٹ میں بھی وہ چھپاک سے مجھ سے پہلے داخل ہو جاتا ہے.....اور لفٹ والا مجھے روک کر کہتا ہے۔

''صاحب گنتی پوری ہو گئی۔''

میں ناچار سیڑھیوں سے بھاگم بھاگ اترتا اور آخری ٹیکسی کو آواز دیتا ہوں میں اس سے پانچ قدم پر ہوتا ہوں کہ وہ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اندر گھس جاتا ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

میری سب سے بڑی حسرت یہ ہے کہ کبھی ایسی قطار میں کھڑا ہوں جس میں مجھ سے آگے کوئی نہ ہو۔ ڈاک خانے اور ریلوے کے ٹکٹ گھر پر سب سے آگے میں ہوں اور ریستوران میں بھی..... جب کوئی اور شخص آئے جس کو جلدی ہو اور جسے دو بجے واپس دفتر جانا ہو تو اسے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے آئس کریم منگاؤں پھر کافی کا آڈر دوں اور شام کا اخبار کھول کر بیٹھ جاؤں۔ اے کاش!

☆☆☆

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

۱۔ http://kitaabghar.com کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔

۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔

۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

نوید طاہر کے نام

ابن انشاء

نوید بیٹا!

دیکھو! تمہاری امی نے ابھی تک کہانی نہیں بھیجی۔ اور اَب تم سے کیا پردہ، الزام تم پر ڈال دیا ہے۔ میں نے مان لیا تم ان کی چوٹی کھینچتی ہوگی اور خاک بھی چاٹ لیتی ہوگی، لیکن اُن سے پوچھو، وہ تمہاری عمر کی تھیں تو کون سے سگھڑاپے کا مظاہرہ کرتی ہوں گی۔ مجھے تو یقین ہے کہ مٹی کے ڈھیلے تھورتی ہوں گی۔ سچ ہے آدمی کو دوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آجاتا ہے، اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ یہ تصویریں میں نے تمہاری آسانی کے لیے بنادی ہیں، کیوں کہ آج کل بڑے بڑے گمراہ کن قاعدے شائع ہو رہے ہیں، وہ مت پڑھنا۔ تم تو بس الف آم اور ب بلی کی تصویروں والا قاعدہ اور مولوی محمد حسین آزاد کی ریڈریں پڑھنا، تاکہ بڑے ہو کر تمہارا دماغ بھی ہماری طرح صاف اور شفاف نکلے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ تمہاری امی چاہتی ہیں کہ تمہیں اور تمہارے برادرِ محترم پرویز صاحب قبلہ کو کھلاؤں، زبان نکال کر بے وقوفوں کی طرح ٹیڑھا میڑھا منہ بنا کر بہلاؤں، اس عمر میں توتلی باتیں کروں، تب کہیں وہ اپنا فونٹین پین نکالیں۔ نہایت انداز سے، پہلے کاغذ پر ایک دو دائرے بنائیں، پھر ''آٹو گراف'' کھینچیں اور اِس کے بعد کسی بے معنی فقرے سے کسی کہانی کا آغاز کرنے کی کوشش کریں۔ مثلاً ''رقیہ یہ دیکھ کر بھونچکی کی بھونچکی رہ گئی۔'' اب کوئی پوچھے، کیوں رہ گئی، کیسے رہ گئی؟ یہ اُن کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں..... اور یہ بھونچکی تو معاف کرنا، چھوٹی پن چکی کو کہتے ہوں گے۔

ہاں تو گویا میں آپ لوگوں کو بہلاؤں۔ اللہ اللہ کیا دن آگئے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ مضمون نگار لوگ ایڈیٹروں کے بچے کھلایا کرتے تھے، تاکہ اُن کے مضامین چھپ جائیں، اب ایڈیٹر سے یہ توقع کی جاتی ہے۔ لیکن نوید بیٹا! سدا یہ دن نہیں رہیں گے، خدا پھر ایڈیٹروں کے دن پھیرے گا..... چناں نہ ماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند..... یہ فارسی ہے، کہیں کسی کمسن بچے کی غوں غاں سمجھ لو۔ چنیں و چناں ایک محاورہ بھی ہے، لیکن ماشاء اللہ تم خود اہلِ زبان ہو۔ تم اپنی گومتی میں ڈھلی ہوئی زبان کو بچانا..... تم حیران ہوگی کہ میں بات کیا کر رہا تھا، یہ گومتی درمیان میں کہاں سے ٹپک پڑی..... پیاری بیٹی! ہم لوگ اسی پریشان خیالی کی تو روٹی کھاتے ہیں۔ ذرا سی بات کو پھندنے لگا کے بڑا کر دیا، ابھی چین کی بات کر رہے ہیں، ابھی توران جا پہنچے ہیں۔ یہ نہ کریں تو صفحے کیسے بڑھیں، مضمون کیسے لمبا ہو، ناول کیسے بھاری بھرکم نظر آئے۔ دیکھو! میں پھر غیر متعلق ہو گیا، کیا کروں، طبیعت سے مجبور ہوں۔

اور دیکھنا، لپک کے پوچھنا، تمہارے پرویز بھیا نے دانت نکال لیے، یا بھیجوں یہاں سے کسی دندان ساز کو۔ یہاں بڑے بڑے باکمال اور کریہہ المنظر دندان ساز ہیں۔ پرویز صاحب انہیں دیکھتے ہی ایک دو دانت تو کیا پوری بتیسی نکال دیں گے۔ ایک بات کہوں، تم لوگوں کی اس

دنیائے دنی میں آنے کی خبر ہمیں اب آ کر تمہاری امیوں کے خطوط سے معلوم ہوئی، حالاں کہ ہم اخبار بھی باقاعدہ پڑھتے ہیں (تم اہلِ زبان کے نزدیک امی کی یہ جمع ٹھیک ہے کیا؟)

اب تم ایک دو باتیں نصیحت کی سن لو، بڑے ہو کر افسانہ نگار مت بننا۔ یہ لوگ بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں قلم نہیں تلواریں ہوتی ہیں..... جس کردار کو چاہیں بادشاہ بنا دیں، جس کو چاہیں پھانسی پر چڑھا دیں۔ ان کو مارنے جلانے کے پورے اختیارات حاصل ہیں۔ ابھی ایک کردار بھلا چنگا باتیں کر رہا ہے، ابھی گلے میں گھنگرو بج رہا ہے۔ ان کو اس میں بڑا مزہ آتا ہے۔ عشقیہ کہانی ہے تو بے کار کو ہیرو کو کنوئیں جھنکوا رہے ہیں، ہیروئن سے رات میں تارے گنوا رہے ہیں۔ اس کے بعد جس کی شادی جس سے جی چاہا کرا دی۔ بالعموم کسی خوبصورت لڑکی کو اُس کے محبوب کی بجائے، کوئی بوڑھا سیٹھ بیاہ کر لے جاتا ہے۔ بھلا کوئی پوچھو، اس میں کیا تک ہے۔ کہانی تو سیدھی صاف ہونی چاہیے..... ''انور اور شکیلہ کی محبت ہو گئی اور پھر شادی ہو گئی''..... زیادہ بڑھانا ہوا تو یہ کہہ دیا کہ ''بعد میں چاند سے بچے بھی پیدا ہوئے'' اللہ اللہ خیر سلا..... لیکن نہیں صاحب، اس میں اینچ پینچ ضرور ہوں، آنسو ضرور ٹپکیں، ظالم سماج پر لعنت ضرور بھیجی جائے۔

سچ پوچھو تو جیسے افسانے یہ تمہاری امی (ہاجرہ مسرور) خالہ (خدیجہ مستور) ماموں (احمد ندیم قاسمی) خالو (ظہیر بابر) وغیرہ لکھتے ہیں، ویسے تو ہم بھی لکھ لیں۔ ہمیں منع تو کوئی نہیں کرتا، لیکن بس یہی عدیم الفرصتی۔ ان شاء اللہ لکھنا شروع کریں گے۔ نظم لکھی، غزل لکھی، تنقید لکھی، اب یہی تو ایک میدان رہ گیا ہے۔ زیادہ اچھا نہ لکھ سکے تو کرشن چندر جیسا تو لکھ ہی لیں گے۔

اچھا اب چلتی بنو، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاؤ، مجھے اپنا کام بھی کرنا ہے۔ یہ نہ کروں، تو روٹی کہاں سے کھاؤں۔ سچ کہتے ہیں بازار میں جادو کا تماشا دکھانے والے..... پیٹ بُری بلا ہے۔ اب کے کراچی آؤ تو ملو ضرور، سمجھیں.....؟

تمہارا، ابن انشاء

☆☆☆

گڑبڑ گھوٹالہ

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی پیشے کے اعتبار سے میڈیکل ڈاکٹر ہیں۔ **گڑبڑ گھوٹالہ** انکی مزاحیہ شاعری کی بہترین کتاب ہے۔ میڈیکل سے متعلقہ الفاظ اور تراکیب کا حسب حال اور برجستہ استعمال نے انکی شاعری میں ایک بہت نمایاں کردار ادا کیا ہے، جسے پڑھ کر قاری بہت محظوظ ہوتا ہے۔ یہ کتاب **مزاحیہ شاعری** سیکشن میں دیکھی جا سکتی ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

استاد مرحوم

ابن انشاء

الہ دین نام تھا اور چراغ تخلص، وطن مالوف ریواڑی جو گڑگاؤں کے مردم خیز ضلع میں اہلِ کمال کی ایک بستی ہے اور آم کے اچار کے لیے مشہور۔ وہاں دھنیوں کے محلے میں ان کی خاندانی حویلی کے آثار اب تک موجود ہیں۔ نگڑ دادا ان کے اپنے فن کے خاتم تھے۔ شاہ غازی اورنگ زیب عالمگیر نے شہرہ سنا تو خلعت و پارچہ دے کر دِلّی بلوایا اور اپنی محل سرا کے لحاف بھرنے پر مامور کیا۔ اللہ دیا نام تھا لیکن نداف الملک کے خطاب سے مشہور تھے۔ دلی میں یہ بارہ برس رہے۔

وجاہتِ خاندانی کے ساتھ دولتِ روحانی بھی استاد مرحوم کو ورثے میں ملی تھی۔ ننھیال کی طرف سے سولھویں پشت میں ان کا سلسلہ نسب نوگزے پیر سے جاملتا ہے۔ جن کا مزارِ اقدس پاکستان اور ہندوستان کے قریب قریب ہر بڑے شہر میں موجود ہے۔ اور زیارت گہہِ خاص و عام ہے۔ انھی دونوں نسبتوں کا ذکر کر کے کبھی کبھی کہا کرتے کہ شاعری میرے لیے ذریعہ عزت نہیں۔ اپنے نام کے ساتھ ننگِ اسلاف ضرور لکھتے۔ دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی انھیں یہی لکھنا شروع کر دیا۔ استاد مرحوم کا پورا نام ان کا حضرت شاہ الہٰ دین چراغ چشتی نظامی ریواڑوی تھا، ہمیں ہائی اسکول میں اردو اور فارسی پڑھاتے تھے۔ وطن کی نسبت سے اردو تو ان کے گھر کی لونڈی تھی ہی، فارسی میں کمال کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ پچیس پشت پہلے ان کے مورثِ اعلیٰ خراسان سے آئے تھے۔ کیوں آئے تھے؟ یہ سوال راقم کے دل میں بھی اکثر اٹھتا تھا۔ آخر ایک روز موقع دیکھ کر پوچھ لیا اور احتیاطاً وضاحت کر دی کہ مقصد اعتراض نہیں، دریافتِ معلومات ہے۔ فرمایا، بابر کیوں آیا تھا؟ احمد شاہ ابدالی کیوں آیا تھا اب جو راقم نے اس سوال نما جواب کی بلاغت پر غور کیا تو اپنی کم فہمی پر بے حد شرمندگی ہوئی۔ بابر نہ آتا تو ابراہیم لودھی کس سے شکست کھاتا؟ خاندان مغلیہ کہاں سے آتا؟ اتنی صدیاں ہندوستان کی رعایا بادشاہوں کے بغیر کیا کرتی؟ مالیہ اور خراج کس کو دیتی؟ کچھ ایسی ہی حکمت استاد مرحوم کے مورثِ اعلیٰ کے ہندوستان آنے میں ضرور ہوگی۔ جس تک معمولی ذہن کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ خیر یہ ذکر تو ضمناً آ گیا۔ مقصودِ کلام یہ کہ خراسان کی نسبت سے فارسی ایک طرح سے ان کے گھر کی زبان تھی۔ عربی کے بھی فاضل تھے، اگرچہ باقاعدہ نہ پڑھی تھی۔ عزیزم اسرار احمد کا نکاح خان بہادر ولایت علی کی پوتی سے ہوا تو استاد مرحوم ہی نے نکاح پڑھایا تھا، اور کوئی کاغذ پرچہ سامنے رکھے بغیر۔

ماشاء اللہ۔ استغفر اللہ، نعوذ باللہ، لاحول ولاقوۃ الا باللہ، ویسے ہی کئی اور عربی کے جملے بے تکان بولتے تھے۔ خیر خراسان بھی کہیں عرب ہی کی طرف کو ہے۔ لہٰذا عربی پر ان کا عبور جائے تعجب نہیں۔ ہاں انگریزی کی لیاقت جو انھوں نے از خود پیدا کی تھی، اس پر راقم کو بھی حیرت ہوتی تھی۔ ایک بار ایک دیہاتی منہ اٹھائے ان کی کلاس میں گھس آیا، حضرت نے فوراً انگریزی میں حکم دیا۔ گٹ آؤٹ۔ اسے تعمیل کرتے ہی بنی۔ علاقے کا مال افسر انگریز تھا۔ ایک روز اسکول میں نکل آیا اور آدھا گھنٹہ گفتگو کرتا رہا۔ استاد مرحوم برابر سمجھتے گئے اور سر ہلاتے گئے۔ بیچ بیچ میں موقع بہ موقع

یس یس اور پلیز پلیز بھی کہتے جاتے تھے۔ پرانے بزرگوں میں سرسید، حالی، شبلی، وغیرہ کے متعلق سنا ہے کہ انگریزی سمجھتے خوب تھے لیکن بولنا پسند نہ کرتے تھے۔ ہمارے استاد کا بھی یہی عمل تھا۔ ہمیں انگریزی میں ان کے تجربے کا پہلے علم نہ تھا۔ ہوا یہ کہ ایک روز ہماری انگریزی کی کلاس میں نکل آئے اور پوچھا لڑکو بتاؤ تو ماش کی دال کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟ سب چپ، کون بتاتا، پھر سوال کیا۔ کریلے کی انگریزی کیا ہے؟ یہ بھی کوئی نہ بتا سکا۔ سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ آخر استاد مرحوم نے بتایا اور ''انگلش ٹیچر'' کھول کر اس کی تصدیق بھی کرادی۔ یہ کتاب جو انگریزی کے علم کا قاموس ہے۔ سفر و حضر میں استاد مرحوم کے ساتھ رہتی تھی اور بڑے بڑے انگریزی دان ان کے سامنے آتے کتراتے تھے کہ جانے کب کسی ترکاری کا انگریزی نام پوچھ لیں۔ انگریزی تحریر پر ان کی قدرت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ دستخط انگریزی ہی میں کرتے تھے۔

استاد مرحوم نے اہلِ زبان ہونے کی وجہ سے طبیعت بھی موزوں پائی تھی اور ہر طرح کا شعر کہنے پر قادر تھے۔ اردو فارسی میں ان کے کلام کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ جو غیر مطبوعہ ہونے کی وجہ سے اگلی نسلوں کے کام آئے گا۔ اس علم و فضل کے باوجود انکسار کا یہ عالم تھا کہ ایک بار اسکول میگزین میں جس کے یہ نگراں تھے، ایڈیٹر نے استاد مرحوم کے متعلق لکھ دیا کہ وہ سعدی کے ہم پلہ ہیں۔ انھوں نے فوراً اس کی تردید کی۔ اسکول میگزین کا یہ پرچہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتے اور ایک ایک کو دکھاتے کہ دیکھو لوگوں کی میرے متعلق یہ رائے ہے، حال آں کہ من آنم کہ من دانم۔ ایڈیٹر کو بھی جو دسویں جماعت کا طالب علم تھا، بلا کر فہمائش کی کہ عزیزی یہ زمانہ اور طرح کا ہے۔ ایسی باتیں نہیں لکھا کرتے۔ لوگ مردہ پرست واقع ہوئے ہیں۔ حسد کے مارے جانے کیا کیا کہتے پھریں گے۔

اہلِ علم خصوصاً شعراء کے متعلق اکثر یہ سنا ہے کہ ہم عصروں اور پیشروؤں کے کمال کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ استاد مرحوم میں یہ بات نہ تھی بہت فراخ دل تھے۔ فرماتے، غالبؔ اپنے زمانے کے لحاظ سے بہت اچھا لکھتا تھا۔ میرؔ کے بعض اشعار کی بھی تعریف کرتے۔ امیر خسرو کی ایک غزل استاد مرحوم کی ایک غزل کی زمین میں ہے۔ فرماتے، انصاف یہ ہے کہ پہلی نظر میں فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون سی بہتر ہے۔ پھر بتاتے کہ امیر خسرو مرحوم سے کہاں کہاں محاورے کی لغزش ہوئی ہے۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کہتے تھے کہ سیالکوٹ میں ایسا شاعر اب تک پیدا نہ ہوا تھا۔ اس شہر کو ان کی ذات پر فخر کرنا چاہیے۔ ایک بار بتایا کہ اقبالؔ سے میری خط و کتابت بھی رہی ہے دو تین خط علامہ مرحوم کو انھوں نے لکھے تھے کہ کسی کو ثالث بنا کر مجھ سے شاعری کا مقابلہ کرا لیجیے۔ راقم نے پوچھا نہیں کہ ان کا جواب آیا کہ نہیں۔

استاد مرحوم کو عموماً مشاعروں میں نہیں بلایا جاتا تھا کیوں کہ سب پر چھا جاتے تھے اور اچھے اچھے شاعروں کو خفیف ہونا پڑتا۔ خود بھی نہ جاتے تھے کہ مجھ فقیر کو ان ہنگاموں سے کیا مطلب۔ البتہ جوبلی کا مشاعرہ ہوا تو ہمارے اصرار پر اس میں شریک ہوئے اور ہر چند کہ مدعو نہ تھے منتظمین نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دیوانہ کسمنڈوی۔ خیالؔ گڑگانوی اور حسرت بانس بریلوی جیسے اساتذہ اسٹیج پر موجود تھے۔ اس کے باوجود استاد مرحوم کو سب سے پہلے پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ وہ منظر اب تک راقم کی آنکھوں میں ہے کہ استاد نہایت تمکنت سے ہولے ہولے قدم اٹھاتے مائیک پر پہنچے اور ترنم سے اپنی مشہور غزل پڑھنی شروع کی ؎

ہے رشتۂ غم اور دلِ مجبور کی گردن ہے اپنے لیے اب یہ بڑی دور کی گردن

ہال میں ایک سناٹا چھا گیا۔ لوگوں نے سانس روک لیے۔ استاد مرحوم نے داد کے لیے صاحبِ صدر کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ ابھی تشریف نہ لائے تھے۔ کرسیٔ صدارت خالی پڑی تھی، دوسرا شعر اس سے بھی زوردار تھا۔

صد حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا اور دار پہ ہے حضرت منصور کی گردن

دوسرا مصرع تمام نہ ہوا تھا کہ داد کا طوفان پھٹ پڑا۔ مشاعرے کی چھت اڑنا سنا ضرور تھا۔ دیکھنے کا اتفاق آج ہوا۔ اب تک شعراء ایک شعر میں ایک مضمون باندھتے رہے ہیں وہ بھی بہ مشکل۔ اس شعر میں استاد مرحوم نے ہر مصرع میں ایک مکمل مضمون باندھا ہے اور خوب باندھا ہے۔ لوگ اسٹیج کی طرف دوڑے۔ غالباً استاد مرحوم کی پابوسی کے لیے لیکن رضا کاروں نے انھیں باز رکھا۔ اسٹیج پر بیٹھے استادوں نے جو یہ رنگ دیکھا تو اپنی غزلیں پھاڑ دیں اور اٹھ گئے۔ جان گئے تھے کہ اب ہمارا رنگ کیا جمے گا۔ ادھر لوگوں کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ تیسرے شعر پر ہی فرمائش ہونے لگی مقطع پڑھیے مقطع پڑھیے..... چوتھے شعر پر مجمع بے قابو ہو رہا تھا کہ صدرِ جلسہ کی سواری آ گئی اور منتظمین نے بہت بہت شکریہ ادا کر کے استاد مرحوم کو بغلی دروازے کے باہر چھوڑ کر اجازت چاہی۔ اب ضمناً ایک لطیفہ سن لیجیے جس سے اخبار والوں کی ذہنیت عیاں ہوتی ہے۔ دوسری صبح روزنامہ ''پتنگ'' کے رپورٹر نے لکھا کہ جن استادوں نے غزلیں پھاڑ دی تھیں، وہ یہ کہتے بھی سنے گئے کہ عجب نامعقول مشاعرے میں آ گئے ہیں۔ لوگوں کی بے محابا داد کو اس بد باطن نے ہوٹنگ کا نام دیا اور استاد مرحوم کے اس مصرع کو ''صد حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا'' بہ وجہ لاعلمی یا شرارت بجائے توارد کے سرقہ قرار دیا۔ بات فقط اتنی تھی کہ منتظمین نے ایڈیٹر پتنگ، کے اہل خانہ کو مشاعرے کے 'پاس' معقول تعداد میں نہ بھیجے تھے۔ اگر یہ بات تھی تو اسے منتظمین کے خلاف لکھنا چاہیے تھا نہ کہ استاد مرحوم کے خلاف اور پھر اس قسم کے فقروں کا کیا جواز ہے کہ استاد چراغ شعر نہیں پڑھ رہے تھے روئی دھن رہے تھے۔ صحیح محاورہ روئی دھننا نہیں روئی دھنکنا ہے۔

اس دن کے بعد سے مشاعرے والے استاد مرحوم کا ایسا ادب کرنے لگے کہ اگر استاد اپنی کریم النفسی سے مجبور ہو کر پیغام بھجوا دیتے کہ مَیں شریک ہونے کے لیے آ رہا ہوں تو وہ خود معذرت کرنے کے لیے دوڑے آتے کہ آپ کی صحت اور مصروفیات اس کی اجازت نہیں دیتیں۔ استاد تو استاد ہیں۔ ہمیں، ان کے ناچیز شاگردوں کو بھی رقعہ آ جاتا کہ معمولی مشاعرہ ہے۔ آپ کے لائق نہیں۔ زحمت نہ فرمائیں۔

استاد مرحوم کو رباعی، قصیدہ، غزل وغیرہ کے علاوہ تضمین سے خاصی دلچسپی تھی۔ میونسپلٹی کے چیئرمین کے بچے کے ختنے پر جو دھوم دھامی مشاعرہ ہوا۔ اس کے لیے آپ نے غالبؔ کی غزل کی مخمس میں تضمین کی تھی۔ اس پر بے انتہا داد ملی۔ جب یہ بند کے چوتھے اور پانچویں مصرعے پر آتے لوگ سبحان اللہ اور جزاک اللہ کے ڈونگرے برساتے۔ یہ سچ ہے کہ استاد مرحوم کا نام اتنا مشہور نہ ہوا جتنا ان کے ہم عصروں اقبالؔ، حفیظؔ، جوشؔ وغیرہ کا۔ بات یہ ہے کہ یہ زمانہ پروپیگنڈے کا ہے اور استاد مرحوم نام و نمود اور چھپنے چھپانے کے قائل نہ تھے۔ ایک بار راقم نے استاد مرحوم کے ایماء پر ان کی کچھ غزلیں مختلف رسالوں کو بھجوائی تھیں۔ ان میں سے ایک لالہ چونی لال خستہؔ کے ریواڑی گزٹ میں آب و تاب سے چھپی لیکن باقی واپس آ گئیں۔ آئندہ کے لیے منع کر دیا اور اپنی طرف اشارہ کر کے یہ شعر پڑھا۔

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو تو کجا بہرِ تماشا می روی

یہی حال ان کے مجموعوں کا ہوا۔ اپنا کلام مضبوط ولائتی کاغذ پر لکھتے تھے۔ اور جب پورا رجسٹر ہو جاتا تو اس کی جلد بندھوا کر جلد اوّل، جلد دوم وغیرہ لکھ کر الماری میں سجا دیتے۔ مولانا کے ہاں مخطوطات کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ اور ایک بات میں تو یہ ذخیرہ برٹش میوزیم، انڈیا آفس، خدا بخش لائبریری وغیرہ کے ذخیروں سے بھی ممیّز اور فائق سمجھنا چاہیے۔ ان کتب خانوں میں سب مخطوطات پرانے زمانے کے ہیں۔ بعض تو ہزار ہزار سال پرانے۔ خستہ اور بدرنگ۔ ہاتھ لگاؤ تو مٹی ہو جائیں لیکن استاد مرحوم کے سبھی مخطوطات نہایت اچھی شکل میں تھے اور زیادہ تر ان کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے۔ بیسویں صدی کے مخطوطات کا اتنا بڑا ذخیرہ غالباً کسی کے پاس نہ ہوگا۔ استاد کی چیزیں جو طباعت کے عیب سے آلودہ نہ ہوئیں، اسے بھی راقم مصلحت خداوندی سمجھتا ہے۔ اگر سبھی چیزیں چھپ جایا کریں تو قلمی نسخے کہاں سے آیا کریں۔ اور قلمی نسخے نہ ہوں تو لوگ ریسرچ کس چیز پر کریں اور ریسرچ نہ ہو تو ادب کی ترقی رک جائے اور پی ایچ ڈی نقاد پیدا ہونے بند ہو جائیں۔ راقم نے ایک بار عرض کیا کہ ان نوادر کو تو کسی ریسرچ لائبریری میں ہونا چاہیے، فرمایا۔ میرا اپنا یہی خیال تھا، اور مَیں نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو لکھا بھی تھا اور مسودات کی فہرست منسلک کی تھی۔ ان بے چاروں نے شکریہ ادا کیا۔ لیکن معذرت کی کہ فی الحال ہماری لائبریری میں جگہ کی کمی ہے۔ البتہ نعمت اللہ کباڑی مرحوم کہ دہلی کے ایک علم دوست گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اکثر ان کے گھر کے چکر کاٹتے تھے اور مخطوطات جدیدہ و مفیدہ کا سارا ذخیرہ اٹھانے کو تیار تھے۔ اماں بی یعنی استاد مرحوم کی منجھلی اہلیہ نے کئی بار کہا بھی کہ اس وقت اچھا بھاؤ جا رہا ہے، تلوا دو لیکن استاد مرحوم نے کبھی لالچ گوارہ نہ کیا۔ جواب دیا تو یہی کہ میرا مقصد جلبِ منفعت نہیں، خدمتِ ادب ہے۔

استاد مرحوم کا خط نہایت پاکیزہ اور شکستہ تھا۔ کسی خاص صنعت میں لکھتے تھے۔ جس کا نام اس وقت راقم کے ذہن سے اتر گیا۔ خوبی اس کی یہ ہے کہ صرف لکھنے والا اسے پڑھ سکتا ہے۔ راقم التحریر کے املا میں بھی جو لوگوں کو یہ خصوصیت نظر آتی ہے۔ ادھر ہی کا فیضان ہے۔ طبیعت میں ایجاد کا مادہ تھا۔ لکیر کے فقیر نہ تھے۔ اب اسی لفظ فیضان کو لیجیے۔ اسے وہ ظ سے لکھتے تھے۔ ایک بار طوطا رام صیاد نے اس پر اعتراض بھی کیا۔ یہ صاحب ہوشیار پور کے رہنے والے تھے اور معمولی تعلیم یافتہ تھے۔ استاد مرحوم نے چمک کر جواب دیا۔ یہ ہماری زبان ہے پیارے۔ ہم جیسا لکھیں گے وہی سند ہوگا۔ ماسٹر جی اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ بعد میں راقم کو استاد مرحوم نے ایک مستند قلمی نسخے میں فیضان ظ سے لکھا ہوا دکھایا۔ اس نسخے کا نام یاد نہیں۔ لیکن کم از کم پچیس سال پرانا ہوگا اور خود استاد مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ ان شہادتوں کے باوجود وسیع القلب اتنے تھے کہ آخر عمر میں فرمایا کرتے۔ ض سے لکھنا بھی غلط نہیں۔ اسی طرح بہت سے اور الفاظ تھے۔ جن کا تلفظ اور املا وہ رواج عام سے ہٹ کر کرتے تھے۔ کوئی انگشت نمائی کرتا تو جواب دیتے کہ ہمارے گڑگاؤں میں یونہی لکھتے اور بولتے ہیں۔ معترض چپ ہو جاتا۔ استاد مرحوم کے اوصافِ حمیدہ کا حال لکھنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ اس مضمون میں اس کی گنجائش نہیں۔ مختصر یہ کہ دریا دل آدمی تھے۔ کوئی شخص کوئی چیز پیش کرتا تو کبھی انکار نہ کرتے۔ دوسری طرف اس بات کا خیال رکھتے کہ کسی کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے۔ کوئی سائل یا حاجت مند آتا تو نہ صرف یہ کہ خود کچھ نہ دیتے۔ دوسروں کو بھی منع کر دیتے تھے کہ یہ بھی تمھاری طرح انسان ہے۔ اس کی خودداری مجروح ہوگی۔ اس شخص کو پند و نصائح سے مطمئن کر کے بھیج دیتے۔ استاد مرحوم کی طبیعت خوشامد سے نفور تھی۔ راقم کو معلوم نہیں کہ محکمۂ تعلیم کے افسروں اور ڈپٹی کمشنر کے علاوہ، کہ حاکم ضلع ہونے کے لحاظ سے اولوالامر کی تعریف میں آتے تھے۔ انھوں

نے کبھی کسی کا قصیدہ کہا ہو البتہ کسی افسر یا سیٹھ کے ہاں شادی ہو تو سہرا کہہ کر لے جاتے اور ترنم سے پڑھ کر سناتے۔ فرماتے یہ وضع داری ہے۔ اس کا انعام کسی نے دے دیا تو لے لیا ورنہ اصرار نہ کرتے۔

اشاعتِ تعلیم سے دلچسپی تھی۔ چناں چہ ہیڈ ماسٹرز صاحب اور انسپکٹر تعلیمات کے بچوں کو پڑھانے جایا کرتے تھے۔ استاد مرحوم کا مسلک صلح کل تھا۔ جس زمانے میں مولوی محمد عمر انسپکٹر تعلیمات تھے یہ تنظیم اہلِ سنت کے جلسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ ان کی جگہ ظل حسنین امروہوی آئے تو ان کو تنظیم سے شکایتیں پیدا ہو گئیں اور اثنا عشری مسجد میں دیکھے جانے لگے۔ اہل بیت کے جو مرثیے ان کے دیوان میں ہیں، اسی زمانے کے ہیں۔ کچھ دنوں قاضی نور احمد کا تقرر بھی اس خدمت پر رہا۔ یہ قادیانی احمدی تھے۔ استاد مرحوم ان دنوں برملا فرماتے کہ مجھے تو اگر اسلام کی سچی روح کہیں نظر آتی ہے تو انھیں کے ہاں۔ اس سال عید کی نماز انھوں نے احمدیوں کی مسجد میں پڑھی۔ فرماتے سبھی خدا کے گھر ہیں۔ کوئی فرق نہیں۔ پنڈت رادھے شیام ہیڈ ماسٹر ان سے ہمیشہ خوش رہے۔ انھیں استاد مرحوم ہی سے معلوم ہوا تھا کہ کرشن جی باقاعدہ نبی تھے اور تورات میں ان کی آمد کا ذکر ہے۔ موسیقی سے شغف تھا اور گلے میں نور بھی تھا۔ لیکن محلے والے اچھے نہیں تھے۔ استاد کی خواہش تھی کہ شہر سے باہر تنہا کوئی مکان ہو تو دل جمعی سے تکمیلِ شوق کریں۔ ویسے کبھی کبھی محفل میں ہارمونیم لے کر بیٹھ جاتے تھے کہ یہی کا ان کا محبوب ساز تھا اور سہگل مرحوم کی مشہور غزل ''نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے'' سنانی شروع کر دیتے۔ ایسے موقع پر نکتہ شناس لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کر کے ایک ایک کر کے اٹھ جاتے کیوں کہ اس فن کے ریاض کے لیے تنہائی ضروری ہے۔ استاد مرحوم ہاتھ دیکھنے میں یدطولیٰ رکھتے تھے اور طبیبِ حاذق بھی تھے۔ آخر میں طبابت تو انھوں نے ترک کر دی تھی۔ کیوں کہ ایک مریض کے رشتہ داروں نے جو ان کے زیرِ علاج تھا اور ان کی تیر بہ ہدف دوا ''حکمی'' کی ایک خوراک کھانے کے بعد خالقِ حقیقی سے جا ملا تھا، بے وجہ ایک فساد کھڑا کر دیا تھا اور نوبت پولیس تھانے تک پہنچی تھی۔ دست شناسی کا شوق البتہ جاری رہا۔ طبابت کی طرح اس فن میں بھی نہ کسی کے شاگرد تھے نہ کوئی کتاب پڑھی، خود فرماتے مبداء فیاض کی دین ہے۔ ماضی کا حال نہایت صحت سے بتاتے۔ لیکن اجنبیوں کا ہاتھ دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ انھی سے کھلتے جن سے دیرینہ واقفیت اور رسم و راہ ہوتی۔ مستقبل کے بارے میں ان کا اصول تھا کہ لوگوں کو صحیح بات نہ بتانی چاہیے ورنہ ان کا تقدیر اور عالم غیب پر سے ایمان اٹھ جاتا ہے۔ اس فن سے ان کی آمدنی خاصی تھی۔ اور اس پر قانع تھے۔ اسکول کی تنخواہ بچا کے خدا کی راہ میں لوگوں کو سود پر دے دیتے تھے۔

ایسی دیدہ زیب شخصیتیں چشمِ فلک نے کم دیکھی ہوں گے جیسے استاد چراغ رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ قد پانچ فٹ سے بھی نکلتا ہوا جسم بھرا بھرا خصوصاً کمر کے آس پاس۔ سر پر میل خورے کپڑے کی ٹوپی اور اس کے ساتھ شیروانی۔ راقم نے کبھی ان کو ٹوپی کے بغیر نہ دیکھا۔ ایک بار خود ہی فرمایا کہ ایک تو یہ خلافِ تہذیب ہے۔ دوسرے کوّے ٹھونگیں مارتے ہیں۔ ٹانگیں چھوٹی چھوٹی تھیں جس کی وجہ سے چال میں بچوں کی سی معصومیت تھی۔ رنگ سرمئی۔ آنکھیں سرخ و سفید اور پھر جلال ایسا کہ مائیں دیکھ کر بچوں کو چھپا لیتی تھیں۔ دانت تمباکو خوری کی کثرت سے شہید ہو گئے تھے۔ لہٰذا تمباکو کو چھوڑ دیا تھا۔ فقط نسوار کا شوق رکھا تھا۔ چشمہ لگاتے تھے لیکن ہماری طرح چشمے کے غلام نہ تھے۔ بالعموم اس کے اوپر سے دیکھتے تھے۔ سرخ کمر بند میں چابیوں کا گچھا چاندی کے گھنگھروؤں کی طرح بجتا۔ دور ہی سے معلوم ہو جاتا کہ حضرت تشریف لا رہے ہیں۔ ایک ہاتھ میں چھے انگلیاں تھیں۔

اس لیے گیارہ تک با آسانی گن لیتے تھے۔ حواس پر ایسا قابو تھا کہ جس محفل میں چاہتے بیٹھے بیٹھے سو جاتے اور خراٹے لینے لگتے۔ پھر آپ ہی آپ اٹھ بھی بیٹھتے کھانے کا شوق ہمیشہ سے تھا۔ خصوصاً دعوتوں میں۔ فرماتے کھانے میں دو خوبیاں ہونی چاہیں۔ اچھا ہو اور بہت ہو۔ کھانے کے آداب کا ذکر کرتے تو فرماتے کہ سب سے پہلے شروع کرو اور سب سے آخر میں ختم کرو۔ جس ضیافت میں استاد مرحوم ہوتے، لوگ کھاتے کم اور ان کی طرف رشک سے دیکھتے زیادہ تھے۔ لیکن یہ جوانی کی باتیں ہیں۔ آخری عمر میں پرہیزی کھانا کھانے لگے۔ میزبان کے ہاں پہلے سے کہلوا دیتے کہ یخنی وغیرہ کا انتظام کر لینا اور میٹھے میں سوائے حلوے کے اور کچھ نہ ہو۔ چوزے کے متعلق فرماتے کہ زود ہضم ہے۔ خون صالح پیدا کرتا ہے۔ دال سے احتراز فرماتے کہ نفخ پیدا کرتی ہے۔

بذلہ سنجی استاد مرحوم کی طبیعت میں ایسے تھی جیسے باجے میں راگ، جیسے تلوار میں جوہر۔ ''لطائف بیربل وملا دوپیازہ'' کے سب لطیفے نوک زبان تھے۔ ان سے محفلوں کو گرماتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ لطیفوں کی تخصیص نہیں۔ لوگ ان کی دوسری باتوں پر بھی ہنستے تھے۔

ایسا بڑا آدمی اور سادگی کا یہ عالم کہ کبھی خیال نہ کیا کہ لباس میلا ہے یا پیوند لگا ہے۔ فرماتے انسان کا من اجلا ہونا چاہیے تن تو ایک عارضی چولا ہے۔ اس مضمون کا کبیر کا ایک دوہا بھی پڑھتے۔ کپڑا پہننے کا سلیقہ تھا۔ ایک کالی اچکن کو پورے بیس سال تک چلایا۔ جب سردی آتی۔ اسی کو جھاڑ کر پہن لیتے۔ فرماتے کپڑے کے دشمن دو ہیں۔ دھوبی اور استری۔ واقعی سچ ہے۔ یہ اچکن جو آخر میں ملگجے رنگ کی ہوگئی تھی اور دور سے چرمی نظر آتی تھی، دھوبی اور استری کے ہتھے چڑھ جاتی تو کبھی کی غارت ہوگئی ہوتی۔ ایک روز اسے پہنے راقم کے ہمراہ کسی قوالی میں جا رہے تھے۔ قوالی کرنے نہیں، سننے، کہ چوراہے پر رکنا پڑا۔ ایک مرد شریف نے نہ جانے کیا خیال کر کے ان کے ہاتھ پر ٹکا رکھ دیا۔ راقم کچھ کہنے کو تھا کہ استاد مرحوم نے اشارے سے منع کر دیا۔ اور ٹکا جیب میں ڈال لیا۔ یہی حال جوتے کا تھا۔ فرماتے جوتا ایسی چیز ہے کہ کبھی ناکارہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تلا پھٹ جاتا تو نیا لگوا لیتے۔ اوپر کا حصہ پھٹ جاتا تو اسے بدلوا لیتے۔ داڑھی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرح پُر رعب، گھنی اور لمبی۔ اسے تراشواتے نہیں تھے۔ فرماتے خدا کا نور ہے۔ بعض لوگوں کا گمان تھا کہ پیسہ بچانے کے لیے ایسا کرتے تھے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ ان کے پاس پیسے بہت تھے اور جمع کرنے کا شوق بھی تھا۔ لیکن پیسے کی طمع ان میں نہ تھی۔

استاد مرحوم یوں تو اپنے سبھی شاگردوں سے محبت کرتے تھے۔ حاجی امام دین سوختہ بیکری والے۔ خلیفہ اے۔ ڈی۔ مقراض مالک جنٹلمین ہیر کٹنگ سیلون۔ حسین بخش مدعی، عرائض نویس وغیرہ سبھی ان کے اخلاق حسنہ اور الطاف عمیم کی گواہی دیں گے لیکن راقم سے ان کو ربط خاص تھا۔ فرماتے میرے علم و فضل کا صحیح جانشین تو ہوگا۔ رات کھانا اکثر راقم کے ساتھ کھاتے اور وقت کی پابندی کا لحاظ اس درجہ تھا کہ ادھر ہم دسترخوان پر بیٹھے ادھر استاد مرحوم پھاٹک سے نمودار ہوئے۔ بچوں سے لگاؤ تھا۔ جو بچہ ہمت کر کے ان کے قریب آتا انعام پاتا۔ ایک بار راقم کے بڑے بھتیجے کو ایک اکنی دی تھی۔ وہ اب تک استاد مرحوم کی یادگار کے طور پر رکھے ہوئے ہے۔ ایک دن فرمایا۔ ایک بات کہوں؟ راقم نے عرض کیا۔ فرمایئے۔ بولے جھوٹ تو نہ سمجھو گے؟ راقم نے کہا۔ خانہ زاد کی کیا مجال! فرمایا۔ تو کان کھول کر سنو۔ میری نظر میں تم جوشؔ، جگرؔ وغیرہ بلکہ آج کل کے سبھی شاعروں سے اچھا لکھتے ہو۔ راقم نے آبدیدہ ہو کر ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور عرض کیا کہ سب آپ کا فیض ہے۔ ورنہ بندہ کچھ بھی نہ تھا۔ قارئین اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ

استاد مرحوم کی نظر کتنی گہری تھی اور رائے کتنی صائب۔ ان کا یہ قول راقم نے اکثر لوگوں کو سنایا۔ بعضوں نے جو انصاف پسند تھے۔ اعتراف کیا کہ ہاں ایسے استاد کا ایسا شاگرد کیوں نہ ہو۔ کچھ ایسے بھی تھے۔ جنھوں نے کہا کہ یہ بات شاید استاد نے فقط تمھارا دل بڑھانے کو کہی ہو۔ ان سے راقم کیا بحث کرتا۔ یہی کہا کہ آپ جو فرمائیں بجا ہے۔ لیکن دل میں سوچا کہ جس شخص کو زندگی بھر تعلق اور زمانہ سازی سے واسطہ نہ رہا ہو وہ اس بات میں کیوں مبالغہ کرنے لگا۔ اور پھر اپنے ایک ادنیٰ شاگرد کے لیے؟

1963ء عجب ظالم سال تھا۔ اس میں دنیا کو ایک طرف صدر کینیڈی کا داغ دیکھنا پڑا اور دوسری طرف علم و فضل اور جود و سخا کا یہ آفتاب جس نے واقعی چراغ بن کر زمانے کو روشن کیا تھا، غروب ہو گیا۔ عمر عزیز کے 82 برس ابھی پورے نہ ہوئے تھے۔ کچھ دن باقی ہی تھے ہائے استاد

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

وصال تاندلیانوالہ ہی میں ہوا جہاں استاد مرحوم پاکستان بننے کے بعد مقیم ہو گئے تھے اور گھی کی آڑھت کرتے تھے۔ سنا ہے معمولی بخار ہوا تھا اور ہر چند کہ اپنے ہی مجربات سے علاج کیا، طبیعت بگڑتی ہی گئی۔ راقم کو خبر ملی تو دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ بے ساختہ زبان سے نکلا "ہائے الہ دین کا چراغ بجھ گیا"۔ عدد گنے تو پورے 1383ھ کیسی برجستہ اور سہل ممتنع تاریخ ہے۔ آج استاد مرحوم زندہ ہوتے تو اس کی داد دیتے۔ استاد کے خاندان کی کیفیت بھی مختصر الفاظ میں عرض کر دوں۔ چار شادیاں تھیں۔ پانچویں عمر بھر نہ کی۔ کیوں کہ شرع سے انحراف منظور نہ تھا۔ آہ بھر کر فرماتے جب تک چاروں زندہ ہیں ایک اور کیسے کر لوں۔ شرع میں چار کی اجازت بھی اس شرط کے ساتھ ہے کہ سلوک یکساں ہو۔ سو الحمد اللہ کہ چاروں کا سلوک ان سے یکساں تھا۔ لیکن استاد بھی ایسے صابر تھے کہ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے۔ اولاد صرف ایک سے ہوئی۔ امید ہے کہ عزیز مکرم ہدایت علی ان کے فرزند اکبر جو خود بھی موزوں طبع ہیں اور فراغ تخلص کرتے ہیں، اپنے والد کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے۔ رسمی تعلیم ان کی زیادہ نہیں۔ صفائے باطن کے مراحل فقیروں کے تکیوں اور قوالی کی محفلوں میں طے کیے۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ استاد مرحوم کے وصال کے بعد سر عام شراب پینا انھوں نے ترک کر دیا تھا۔ اور افیم بھی اب اعتدال سے کھاتے ہیں۔ یہ بھی اپنے نامی والد کی طرح روپے کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں۔ لہٰذا تعزیت کے خط کے جواب میں فوراً پانچ سو روپے منگوا بھیجے۔ راقم نے لکھا کہ عزیزی اس خانوادے پر متاع دل و جان نثار کر چکا ہوں۔ روپیہ کیا پیچھے رہ گیا؟ تم یوں کرو کہ استاد مرحوم کی قبر پر سبز چادر چڑھا کر بیٹھ جاؤ۔ خدا برکت دے اور وہیں زرق پہنچا دیا کرے گا۔ اور اگر فتح علی مبارک علی راضی ہو جائیں تو سبحان اللہ۔ سال کے سال عرس سراپا قدس کا اہتمام بھی کرو۔ معلوم نہیں یہ خط ان کو ملا کہ نہیں کیوں کہ پھر جواب نہیں آیا اور راقم کو بھی مکروہات دنیوی سے اتنی فرصت نہ ملی کہ دوبارہ خط لکھتا۔

☆☆☆

سیزر، ماتا ہری اور مرزا

مشتاق احمد یوسفی

''ہائے اللہ! یہ ہاتھی کا ہاتھی کتا کاہے کو لے آئے؟''

''چوکیداری کے لیے۔''

''کس کی؟''

''گھر کی''

''اِس گھر کی؟''

''ہاں! بہت ہی ہوشیار کتا ہے۔ گھر میں کچھ نہ ہو، تب بھی چوکیدارہ کر سکتا ہے۔''

اس ازدواجی مکالمے کے بعد یہ فائدہ ضرور ہوا کہ تنخواہ ملتے ہی ہم نے گھر گرہستی کا ضروری سامان خرید ڈالا تا کہ کتا اس کی چوکیداری کر سکے، لیکن والدین کی سمجھ میں آنے والا جو فوری فائدہ ہم نے سردست بیان کیا، اس سے اپنے معصوم بچوں کو جان بوجھ کر محروم رکھنے کے لیے پتھر کا کلیجہ چاہیے۔ وہ فائدہ یہ تھا کہ آخر کو یہ ایک انگریز کا کتا تھا، اور یہ کون نہیں جانتا کہ ہمارے ہاں اَن پڑھ سے اَن پڑھ آدمی بھی اپنے کتے کا نام انگریزی رکھتا ہے اور انگریزی ہی میں اس سے بات چیت اور ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے۔ چناں چہ ہم نے اشارتاً توجہ دلائی کہ اس کی وجہ سے بچوں کو انگریزی بولنا آجائے گی۔ یہ سنتے ہی بیگم نے کتے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور زنجیر ایسے فیصلہ کن جھٹکے کے ساتھ ہمارے ہاتھ سے چھین لی، جیسے لیڈی میکبتھ نے میکبتھ کے ہاتھ سے خنجر چھینا تھا:

INFORM OF PURPOSE!

GIVE ME THE DAGGER.....

یادش بخیر! اس ڈراپ سین سے کوئی بیس سال ادھر جب آتش جوان بلکہ نوجوان تھا، اس نے نیلی آنکھوں، بھری بھری ٹانگوں اور ''بلونڈ'' بالوں والی میم کو باغ میں اپنے جیبی سائز کے ''پومرینین'' کتے کو بھینچ بھینچ کر پیار کرتے دیکھا تھا۔ تھا بھی ظالم اسی قابل۔ گول مٹول۔ جھبرا، سفید گالا سے بالوں سے سارا جسم اس بُری طرح ڈھکا ہوا تھا کہ جب تک چلنا شروع نہ کرے، یہ بتانا مشکل تھا کہ منہ کس طرف ہے۔ ہائے! وہ بھی کیا زمانہ تھا جب ہر چیز جوان تھی ہر چیز حسین تھی۔ ہر چیز پر پیار آتا تھا کیسے مہکتے دہکتے دن تھے وہ بھی۔

؎ مری سانس میں ہے گرمی کہ یہ لُو سی چل رہی ہے

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن ان گنہگار آنکھوں کو زنجیر کے دونوں سروں پر حُسن نظر آیا اور دل میں یہ پیار بھری حسرت کروٹیں لینے لگی

کہ انگریز کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد کبھی فراغت اور گوشۂ چمن نصیب ہوا تو ایک نیلی آنکھوں، بھری بھری ٹانگوں اور ''بلونڈ'' بالوں والا کتا ضرور پالیں گے مگر ایک تو بہ قول مرزا اعلیٰ نسل کے کتے باوا کے مول ملتے ہیں۔ دوسرے اس زمانے میں مکان اتنا تنگ تھا کہ جانور کا تندرست رہنا محال۔ وہ تو خدا بھلا کرے مسٹر ایس کے ڈین (شیخ خیر الدین) ایم اے (آکسن) کا، جو ہماری آتش شوق کو ہوا دیتے رہے۔ یہ ہمارے دُور پرے کے عزیز ہمسائے تھے ان کے پاس ایک بڑا جید کتا تھا۔ خالص ''گرے ہاؤنڈ''، جسے وہ پڑوسیوں کا خون پلا پلا کر پال رہے تھے۔ دہن رسا رکھتا تھا جسم تیتے جیسا اور مزاج بھی ایضاً۔ یوں تو بھونکنے کے تمام متداول اصناف میں استادانہ مہارت رکھتا تھا، لیکن چاندنی چھٹکی ہو اور طبیعت حاضر، تو پھر کچھ ایسی ''اوریجنل'' طرز اختیار کرتا کہ جتنی مرتبہ بھونکتا، طبیعت کو ہر بار ایک نئی کوفت حاصل ہوتی۔ دیکھا گیا ہے کہ ایسے ویسے شوقیہ بھونکنے والے کتوں کا سانس تو دو چار دفعہ ہی ٹیاؤں ٹیاؤں کرنے میں اکھڑ جاتا ہے۔ مگر یہ کتا بہ قول مرزا، اردو میں بھونکتا تھا، یعنی بھونکتا ہی چلا جاتا تھا۔ کہنے والے کہتے تھے کہ مسٹر ایس۔ کے ڈین اپنے نج کے بزرگوں کو اپنے لائق نہیں سمجھتے۔ مگر اپنے اصیل کتے کا شجرۂ نسب پندرھویں پشت تک فرفر سناتے اور اس کے آباؤ اجداد پر اس طرح فخر کرتے، گویا ان کا خالص خون ان کی ناچیز رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ کہتے تھے، نہر سوئیز کے اس طرف اتنا خالص وخوں خوار کتا ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا۔ اس کا دادا پندرہ جون ۱۹۴۱ء کو پانڈیچری میں دیسی کتوں سے لڑتا ہوا مارا گیا، چاندنی رات، ہُو کا عالم، چوراہے پر گھمسان کا رن پڑا، کتوں کے پشتے لگ گئے تھے، محلے میں مشہور تھا کہ مسٹر ڈین کے ہاں کوئی گھبرایا گھبرایا فائر بریگیڈ کو فون کرنے بھی چلا جائے تو اسے اپنے مرحوم کتوں کے البم دکھائے بغیر فون کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ ڈرائنگ روم میں مسٹر ڈین کی ایک بڑی سی تصویر بھی ٹنگی تھی، جو انھوں نے اپنے کتے کے جیتے ہوئے کپ اور ٹرافیوں کے ساتھ کھڑے ہو کر اور اس کے تمغے کوٹ پر لگا کر کھنچوائی تھی۔ ہماری دیرینہ حسرت وشیفتگی کے پیشِ نظر ایک دن تخلیے میں ہمیں اپنے ٹیپ ریکارڈر پر موجود کتے کے والد مرحوم کا بھونکنا سنایا۔ سن کر خود آبدیدہ ہوئے اور ہمیں بھی ان کی حالت دیکھ کر رونا آ گیا۔

کتا پالنے کی حسرت کا اظہار ہم نے بارہا مرزا کے سامنے کیا، مگر وہ کتے کا نام آتے ہی کاٹنے کو دوڑتے ہیں، ''ہٹاؤ بھی! واہیات جانور ہے، بالکل بے مصرف، کتے کی تخلیق کا واحد مقصد یہ تھا کہ پطرس اس پر ایک لاجواب مضمون لکھے۔ سو یہ مقصد، عرصہ ہوا پورا ہو چکا اور اب اس نسل کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔'' وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ نسل ناپید بھی ہو گئی تو اردو طنز نگاروں سے نام چلتا رہے گا۔ یوں تو سبھی جانوروں کے بارے میں مرزا کی معلومات ظالمانہ حد تک ادھوری ہیں (مثلاً ابھی کل شام تک وہ لومڑی کو گیدڑ کی مادہ سمجھے بیٹھے تھے اور..... غضب خدا کا..... بڑے چیونٹے کو عام چیونٹی کا، نر!) مگر کتوں کے ساتھ وہ خصوصیت سے تعصب برتتے ہیں اور اپنی بات کی پچ میں ایک سے ایک دلیل پیش کرتے ہیں مثال کے طور پر ایک دن کہنے لگے:

''جس گھر میں کتا ہو، اس گھر میں چور ہی نہیں، رحمت کے فرشتے بھی داخل نہیں ہو سکتے۔''

''چور کا داخل نہ ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، مگر رحمت کے فرشتوں کو کیا ڈر ہے؟''

''اس لیے کہ کتا ناپاک ہوتا ہے۔''

''مگر کتے کو صاف ستھرا بھی تو رکھا جا سکتا ہے، انگریزوں کو دیکھیے، صبح وشام نہلاتے ہیں۔''

''اُپلے کو اگر صبح و شام صابن سے دھویا جائے تو کیا پاک ہو جائے گا؟''

''مگر سوال یہ ہے کہ کتا ناپاک کیسے ہوا؟''

''کج بحثی کوئی تم سے سیکھے۔ اللہ بخشے، نانی جان کہا کرتی تھیں کہ کتے کے منہ میں سؤر کی رال ہوتی ہے۔''

''لیجیے آپ نے ناپاکی کی ایک اچھوتی توجیہہ تلاش کر لی۔''

''بھائی میرے! ایک موٹی سی پہچان آج تمھیں بتائے دیتا ہوں یاد رکھو، ہر وہ جانور جسے مسلمان کھا سکتے ہیں، پاک ہے۔''

''اس لحاظ سے مسلمان ممالک میں بکروں کو، اپنی پاکی و طہارت کے سبب، خاصا نقصان پہنچا ہے۔''

''بگنے والے بکا کریں، مسلمانوں نے کتے کو ہمیشہ کتا ہی کہا، بڑے آدمیوں کے نام سے نہیں پکارا۔''

''بڑے آدمیوں کی ایک ہی رہی ہے۔ آپ نے سنا نہیں کہ نسلاً سب کتے ایک زمانے میں بھیڑیے تھے؟ آدمی کی صحبت میں ان کا بھیڑیا پن جاتا رہا مگر خود آدمی.....''

''دیکھو، تم پھر لٹریچر بولنے لگے۔ علموں بس کریں او یار!''

اس بارۂ خاص میں مرزا کے نسلی تعصب کی جڑیں ان کے سگ گزیدہ بچپن تک پہنچتی ہیں۔ اس لیے ہم نے خواہ مخواہ ان سے الجھنا مناسب نہ سمجھا اور چپ چاپ کتا رکھنے کی آرزو کو پالتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ دن آ گیا، جب ہمارا انگریز افسر بھاری دل اور اس سے زیادہ بھاری قدموں کے ساتھ اپنے وطن کی جانب روانہ ہوا۔ اور روانگی سے قبل اس تعلق خاطر کی بنا پر جو ہم کو اس سے اور اس کو اپنے کتے سے تھا، دریافت کیا: ''تم چاہو، تو میرا کتا بہ طور یادگار رکھ سکتے ہو۔ امپورٹڈ السیشن ہے۔ تیرہ ماہ کا۔ سیزر، کہہ کر پکارو تو دم ہلاتا آتا ہے''۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے، اس صلائے خاص میں ایک کمزور دل کے آدمی کے لیے للچاہٹ کے کیا کیا سامان پوشیدہ تھے اس میں مطلق شبہ نہ تھا کہ اس سے بہتر کوئی یادگار نہیں ہو سکتی کہ جب بھی وہ بھونکے گا، افسر کی یاد تازہ ہو جائے گی۔ پھر یہ کہ السیشن! کبھی ہم اس کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں! افسر کی ادنیٰ مہربانی سے ہمیں اتنی خوشی ہوئی ہے کہ بہ قول مرزا، اگر اس وقت ہماری دُم ہوتی تو ایسی ہلتی کہ پھر نہ تھمتی۔

رہی سہی ہچکچاہٹ کو لفظ ''امپورٹڈ'' نے دُور کر دیا۔ اس زمانے میں ہر وہ شے جو وطن عزیز میں پیدا نہ ہوئی ہو، قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ چناں چہ ہر بگڑا ہوا مسلمان رئیس یہ ثابت کرنے پر تلا بیٹھا تھا کہ نہ صرف اس کے کتے کے، بلکہ اس کے اپنے بزرگ بھی اصلی امپورٹڈ تھے اور خالی ایک تلوار لے کر ماوراء النہر سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے امپورٹڈ کتا سماج میں کیا حیثیت رکھتا ہے، اس کا سرسری سا اندازہ ان واقعات سے لگایا جا سکتا ہے جو دو سال پیشتر ہماری نظر سے گزر چکے تھے ہم سے چار گھر دور مسٹر خلجی بیرسٹر رہتے تھے ان کے والد مرحوم نے چند نایاب کتے ترکے میں چھوڑے تھے (چھوڑنے کو تو چند نایاب کتابیں بھی چھوڑی تھیں، مگر وہ بھی کتوں ہی سے متعلق تھیں، اس لیے ہم نے قصداً ذکر نہیں کیا) انھیں میں ایک دوغلی کتیا تھی۔ (جس کے متعلق ان کا فخریہ دعویٰ تھا کہ اس کی نانی جوزیفین کے تعلقات راسپوٹین سے رہ چکے تھے، جو ایک امپورٹڈ ''گریٹ ڈین'' کتا تھا۔ نیز یہ کہ وہ شملہ سول اینڈ ملٹری کینل سے اس واردات کلبی کا سرٹیفکیٹ حاصل کر چکے ہیں، جو ان کے سونے کے کمرے میں

آج بھی آنکھوں کو نور، دل کو سرور بخشتا ہے۔) نام ماتا ہری رکھ چھوڑا تھا۔ کسی زمانے میں اسی کے لجلجے کان ہر وقت لٹکے رہتے تھے۔ مگر انھوں نے شہر کے بہترین سرجن سے آپریشن کرا کے السیشن کی طرح کھڑے کرا لیے تھے رنگ ہلکا براؤن جیسے میٹھی آنچ پر سینکا ہوا توس (بیرسٹر صاحب کی اینگلو انڈین بیوی) جو خود بھی بڑی بھری پُری عورت تھی اور سلطنت کی طرح دست بہ دست آئی تھی۔ اس پر اپنے ہاتھ سے یوڈی کلون چھڑک کر، مگرمچھ کی کھال کا جڑاؤ کالر پہنائے گھمانے لے جاتی اور اپنے جوتے سے میچ کرنے کے لیے اس پر ٹوتھ برش سے خضاب لگا دیتی۔ کبھی سیاہ، کبھی بولتا ہوا عنابی۔ یہ تو گرمیوں کی شاموں کے معمولات میں سے تھا۔ جاڑے میں ماتا ہری فرنچ برانڈی کے دو چمچے غٹا غٹ پی کر ایرانی قالین پر اپنی مالکہ کی طرح اطالوی ریشم کی انگیا کی تہمت لگائے سوتے جاگتے پہرا دیتی تھی۔ صورتاً بھیڑیا اور سیرۃً بھیڑ۔ ہم بھیڑ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ صبح و شام ولایتی بسکٹ اور ڈبے کا گوشت کھاتے رہنے کے باوجود (یا شاید اسی وجہ سے) بقر عید کی رات کو محلے کے قصائی کے ساتھ بھاگ گئی اور تین شب بعد مٹکتی مٹکاتی لوٹی بھی تو اس طنطنے سے کہ ایک درجن رفقائے حیات جلوں میں، چال جیسے قرۃ العین حیدر کی کہانی. پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی خوش صحبتی کے گلی گلی چرچے، مگر ذہانت چھو کر نہیں گئی تھی، بہ قول مرزا بالکل گدھی تھی۔ انھی سے مروی ہے کہ اکثر بازاری کتیوں کے پلے آکر چسر چسر اس کے دودھ کا آخری قطرہ تک پی جاتے اور اپنے بچے دم ہلاتے یا پلاسٹک کی ہڈیاں چچوڑتے رہ جاتے مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ چوکیداری کے لیے چنداں بُری نہ تھی کہ اپنی عزت آبرو کے علاوہ ہر چیز کی بہ خوبی حفاظت کر سکتی تھی۔ اس کے یہ لچھن دیکھے تو بیرسٹر صاحب نے اس کی رکھوالی کے لیے چوکیدار رکھا اسی سال گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ اپنے کنبے اور کتیا سمیت کار سے مری جانے لگے تو ان کے نانا جان قبلہ نے اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ بس اڑ گئے کہ مَیں اس ''نجس کتی'' کے ساتھ کار میں سفر نہیں کر سکتا لہٰذا بیرسٹر صاحب ان کو ہمارے ہاں چھوڑ گئے۔ جتنے دن بزرگوار موصوف ہمارے ہاں مہمان رہے بعد نماز عشا ہاتھ پھیلا پھیلا کر منتقم حقیقی سے دعا مانگتے کہ پروردگارا! مال زادی ماتا ہری سالانہ زچگی میں اپنے کیفر کردار کو پہنچے۔ کتیا کہیں کی! ہر رنگ، ہر سائز کی گالی ان کی روزمرہ گفتگو میں نگینے کی طرح جڑی ہوتی۔ دن بھر نماز کی چوکی پر بیٹھے سب کو حسب مراتب خورد و کلاں گالیاں دیتے رہتے دعا میں بھی بے ساختہ یہی رنگ رہتا۔ مرزا کا خیال تھا کہ اگر وہ اپنے دل پر جبر کر کے دعا میں سے گالیاں حذف کر دیتے تو ساری تاثیر جاتی رہتی۔ جو دعا دل سے نہ نکلے کیوں کر مستجاب ہو سکتی ہے؟ اوقاتِ دعا کے علاوہ ہر آئے گئے کے سامنے اپنے نافرمان نواسے کے امتیازی سلوک کی شکایتوں کے دفتر کھول دیتے۔ ان کے تمام شکوے شکایتوں کا لب لباب بس یہ تھا کہ میرے ساتھ کتے جیسا سلوک کیوں نہیں کیا جاتا! آخر مَیں بھی جان دار ہوں۔

امپورٹڈ کتے کی چھیل چھبیلی نواسی کی یہ لذیذ حکایت بیان کرنے کا مدعا یہ ہے کہ لفظ ''امپورٹڈ'' نے انگریز افسر کے منہ سے نکلتے ہی ہماری مدافعت کی دیوار کو جو کبھی بھی بہت بلند اور پختہ نہ تھی، یک لخت ڈھا دیا بھلا ایسے صحبت یافتہ کتے روز روز کہاں ملتے ہیں۔ بالآخر شوق فضول ہمارے فطری خوف پر غالب آیا اور جہاز کا لنگر اٹھنے سے پہلے ہم نے اپنے آپ کو ایک خوش نصیب کتے کا مالک پایا۔ لیکن ایک بات کے لیے ہم بھی ذہنی بلکہ جسمانی طور پر تیار نہ تھے ''تیرہ ماہ'' کی عمر سن کر ہمارے تصور میں ایک بہت ہی بھولی بھالی صورت ابھری تھی۔ ہم نے سوچا جیسے تیرہ مہینے کا آدمی کا بچہ بڑا پیارا سا ہوتا ہے تھن متھنا، گبدا سا، غاؤں غاؤں کرتا ہوا، ویسا ہی یہ بھی ہوگا، سچ تو یہ ہے کہ بچہ کسی کا بھی ہو، بڑا ''سویٹ'' لگتا ہے۔ پھر یہ تو السیشن

کا بچہ ٹھہرا، جی ہاں بچہ! دراصل ہم اس کے ''امپورٹڈ'' ہونے سے اس قدر مرعوب تھے کہ پلا کہتے ہوئے خود شرم سی محسوس ہوتی تھی۔

مگر سیزر ہر اعتبار سے ہماری توقعات سے بڑھ کر نکلا اس کا سراپا کھینچ کر ہم ناظرین کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ اس کے ڈیل ڈول کا سرسری سا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے دیرینہ کرم فرما پروفیسر قاضی عبدالقدوس کی سالم ران اس کے منہ میں آجاتی تھی۔ اور یہ پروفیسر مذکور ہی نے بتایا کہ بندۂ خدا! تم نے بھی بڑا غضب کیا! تیرہ مہینے کا السیشن تو پورا پاٹھا کٹا ہوتا ہے کتابوں میں لکھا ہے کہ تین مہینے سے زیادہ کا السیشن نہیں لینا چاہیے اس پر مرزا نے یہ نمک چھڑکا کہ آنکھوں دیکھی بات ہے، کتے کی تندرستی اور نسلی اگر مالک سے بہتر ہو تو وہ آنکھیں ملا کر ڈانٹ بھی نہیں سکتا۔ پھر یہ تو غیر معمولی طور پر خوں خوار بھی نظر آتا ہے۔ ہم نے کہا مرزا تم خواہ مخواہ ڈرتے ہو۔ بولے جو شخص کتے سے بھی نہ ڈرے مجھے اس کی ولدیت میں شبہ ہے۔ ہم نے کہا مرزا کتا اگر خوں خوار نہ ہو تو پالنے سے فائدہ؟ پھر آدمی بکری کیوں نہ پال لے۔ بولے، ہاں! بکری کتے سے بدرجہا بہتر ہے۔ بڑی بات یہ کہ جب چاہو، کاٹ کر کھا جاؤ۔

گرچہ چھوٹی ہے ذات بکری کی　　دل کو بھاتی ہے بات بکری کی

بحث بحثی میں ہم دونوں پٹڑی سے اتر گئے تھے لہٰذا پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے بہ حیثیت ثالث بالخیر بیچ میں پڑ کے اس معتدل رائے پر بحث ختم کی کہ کتے میں سے اگر جبڑا نکال دیا جائے تو خاصا معقول اور مخلص جانور ہے۔

قاضی عبدالقدوس نے کچھ غلط نہیں کہا تھا کہ بڑا کتا بڑی مشکل سے سدھایا جاتا ہے پھر نیا گھر، نئے چہرے، نئی بو باس، نتیجہ یہ کہ پہلی رات خود سویا نہ دوسروں کو سونے دیا رات بھر ایک سانس میں منہ زبانی بھونکتا رہا دوسری رات بھی وحشت کا یہی عالم رہا۔ البتہ چوبیس گھنٹے کی تربیت سے اتنا فرق ضرور پڑا کہ فجر کے وقت جن اراکین خاندان کی آنکھ لگ گئی تھی، ان کے منہ چاٹ چاٹ کر خواب غفلت سے بیدار کیا تیسرے رتجگے سے پہلے ہم نے اسے ایک سونے کی گولی دی کوئی افاقہ نہیں ہوا چوتھی رات دو دیں، مگر صاحب! کیا مجال، جو ذرا چپکا ہو جائے زچ ہو کر مرزا سے رجوع کیا تو کہنے لگے، میری مانو، آج اسے کچھ نہ دو، خود تین گولیاں کھا لو، ہم نے ایسا ہی کیا، اس رات وہ بالکل نہیں بھونکا! لیکن حیرت اس بات پر ہوئی کہ صبح دس بجے ہمارے بہرے ہمسائے خواجہ شمس الدین (امپورٹر اینڈ ایکسپورٹر) نے، جو نئے نئے پڑوس میں آئے تھے، ہمیں بڑی بدتمیزی سے جھنجھوڑ کر جگایا اور شکایت کی کہ رات بھی آپ کا کتا میرے گھر کی طرف منہ کر کے خوب بھونکا۔ اور (ہیئر نگ ایڈ یعنی سننے کا آلہ اپنے کان میں فٹ کرتے ہوئے) اور دیکھ لیجیے، اس وقت بھی بہت جی لگا کر بھونک رہا ہے! ہم نے کہا، آپ کا ریڈیو بھی تو سارے سارے دن محلے کو سر پر اٹھائے رکھتا ہے خدا گواہ ہے جس دن سے آپ پڑوس میں اٹھ کر آئے ہیں، ہم نے اپنے ریڈیو پروگرام سننا بند کر دیا ہے پھر یہ کہ ہمارے پاس تو کتے کا لائسنس بھی ہے لائسنس کا نام آتے ہی ان کے چہرے کا رنگ سیاہ سے بینگنی ہو گیا جس کے نتیجے میں وہ اور ان کا ریڈیو تین ہفتے تک خاموش رہے۔ البتہ ان کے چوکیدار کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کے اپنی ہیئر نگ ایڈ کان سے لگا کر سنتے ہیں کہ ہمارا کتا بھونک رہا ہے یا سو گیا ہمارے کانوں میں یہ بھنک بھی پڑی کہ اب وہ ہر ایک سے یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ بعض نادہندہ اپنے قرض خواہوں سے بچنے کے لیے کتے پال لیتے ہیں وہ یہ کہتے بھی سنے گئے کہ سیزر اشرافوں کا کتا معلوم نہیں ہوتا ادھر ان کی بیوی کی بدگمانی کا یہ حال تھا کہ سیزر جھوٹوں بھی دروازے میں سے جھانک لے تو جھٹ ہاتھ بھر کا

گھونگھٹ نکال لیتی تھیں۔ تین ہفتے بعد دیکھا کہ پھر منہ پھلائے کلبہ احزاں کی طرف چلے آرہے ہیں ہمارے پُر جوش السلام علیکم کے جواب میں فرمایا، دیکھیے اس سؤر کے بچے نے کیا کیا ہے؟ مرزا بیچ میں بول اٹھے منہ سنبھال کر بات کیجیے۔ وہ کتے کا بچہ ہے اس جملۂ معترضہ کے بعد ہم بھی کچھ سخت بات کہنے والے تھے کہ مرزا نے جو ہمارے ساتھ ''لوڈو'' کھیل رہے تھے، ہمارے کہنی مار کر اپنی چھجے دار بھوؤں کی جنبش سے خواجہ شمس الدین کی بائیں ٹانگ کی طرف اشارہ کیا جو گھٹنے تک پائینچے سے بے نیاز تھی۔ ہم نے کن انکھیوں سے دیکھا تو زخم واقعی اتنا لمبا تھا کہ زپ لگا کر آسانی سے بند کیا جا سکتا تھا۔ ندامت اور انسانی ہمدردی کے جذبات سے مغلوب ہو کر ہم نے پوچھا:

''کیا کتے نے کاٹا ہے؟''

''جی نہیں! مَیں نے خود ہی کاٹا ہے!''

''ارے صاحب! گھوڑے بھی کچھ کم ظالم نہیں ہوتے؟'' مرزا پھر بول اٹھے۔

مرزا کا یہ پُر شماتت وار ایسا اچانک اور کاری تھا کہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ ایک دفعہ تو اپنے جسمانی زخم بھول گئے اور اندرونی چوٹوں کو سہلاتے اور گھوڑوں کی ماں بہنوں کو ارمان بھری گالیاں دیتے ''فیڈ آؤٹ'' ہو گئے۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ ان کے بزرگ خیبر پار سے گھوڑے بیچنے ہندوستان آئے تھے اور مالا مال ہو کر یہیں پڑ رہے آگے چل کر ان بزرگوں کی اولاد کو انھی گھوڑوں کی ناخلف اولاد نے تباہ کر دیا وہ اس طرح کہ اس خانوادے کے آخری چشم و چراغ خواجہ شمس الدین کی ''بلیک'' کی کمائی کی ایک ایک پائی ریس میں انھی گھوڑوں کے بھینٹ چڑھتی اور ان کے اپنے اہل و عیال انکم ٹیکس والوں کی طرح منہ دیکھتے رہ جاتے۔

اس نوع کی خوش طبعی سے قطع نظر سیزر ابتدائے سن بدتمیزی سے پرلے درجے کا کاہل واقع ہوا تھا اور دور دوڑ کر کام کرنے کی بجائے دن کے بیشتر حصے میں دروازے پر محراب کی شکل میں چھائی ہوئی بوگن ولیا کے سائے میں لوٹیں لگاتا رہتا درزی کی سوئی یوں تو ہر طرح کے کپڑے میں سے نکلتی ہے، مگر ایمان کی بات ہے، ہم نے سیزر کو کبھی کسی غلط آدمی کو کاٹتے نہیں دیکھا اور یہ کہنا تو سراسر غلط بیانی اور تہمت طرازی ہوگی کہ وہ بالکل جنگلی یا بے کہا تھا، سدھا سدھایا ضرور تھا، مگر صرف پچاس فیصد، اس اجمال پُر ملال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر بچے حکم دیتے کے جاؤ، اس راہ گیر کے پیچھے لگ جاؤ، تو یہ میرا شیر اپنی کمین گاہ سے نکل کر تعمیلاً جھپٹ پڑتا اور اس کی ٹائی پکڑ کر لٹک جاتا، لیکن جب دوسرا حکم ملتا کہ چھوڑ دو تو مجال ہے جو چھوڑ دے۔

مرزا کہ مبدائے فیاض نے حد درجہ محتاط اور وہمی طبیعت ودیعت کی ہے ہمیں یقین ہے کہ انھیں آب حیات بھی پینا پڑے تو بغیر اُبالے نہیں پئیں گے۔ اسی وضعِ احتیاط کے باعث انھوں نے سیزر کے آنے کے بعد ہمارے ہاں آنا جانا اتنا کم کر دیا کہ کبھی بھولے بھٹکے آ نکلتے تو ہم سب ان کی ایسی خاطر مدارت کرتے، ایسی گرمجوشی سے ملتے کہ انھیں خدشہ ہونے لگا کہ ہم قرض نہ مانگ بیٹھیں۔ ایک دن ہمارے ایما پر پروفیسر عبدالقدوس مرزا کو طرح طرح سے سمجھانے لگے کہ کتا بڑا بے نظیر جانور ہے کتے کے سوا کوئی جان دار پیٹ بھرنے کے بعد اپنے پالنے والے کا شکر ادا نہیں کرتا غور کرو، دم دار جانوروں میں کتا ہی تنہا ایسا جانور ہے جو اپنی دم کو بطور آلہ اظہار خلوص و خوشنودی استعمال کرتا ہے۔ ورنہ باقی ماندہ گنوار جانور تو اپنی پونچھ

سے صرف مکھیاں اُڑاتے ہیں، دنبہ یہ بھی نہیں کرسکتا، اس کی دم صرف کھانے کے کام آتی ہے البتہ بیل کی دم سے ''ایکسی لیریٹر'' کا کام لیا جاتا ہے، مگر تمھیں بیل گاڑی تھوڑی دوڑانی ہے۔ (مرزا کے زانو پر ہاتھ مار کر) ہائے! ایک فرانسیسی ادیبہ کیا خوب کہہ گئی ہے کہ مَیں آدمیوں کو جتنے قریب سے دیکھتی ہوں، اتنے ہی کتّے اچھے لگتے ہیں! (لہجہ بدل کر) کتوں سے ڈرنا بڑی نادانی ہے اور بزدلی ہے۔ خصوصاً ولایتی کتوں سے! پھر مرزا کا ڈر نکالنے کے لیے انھی کے کھچڑی سر کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ انگریزوں کے کتوں کے دانت مصنوعی ہوتے ہیں! کھانے کے اور، کاٹ کھانے کے اور! قسموں سے بھی بات بنتی نظر نہ آئی تو ہماری طرف اشارہ کر کے اپنا ذاتی تجربہ بیان کیا کہ ان کی دیکھا دیکھی مَیں نے بھی تین ہفتے سے ایک دم کٹا ''کاکراسپنیل'' پلا پال رکھا ہے۔ کاکراسپنیل کی مشہور پہچان معلوم ہے؟ اس کے کان اس کی ٹانگوں سے لمبے ہوتے ہیں اور ٹانگیں اتنی چھوٹی کہ زمین تک نہیں پہنچ پاتیں!: دو ہفتے تک تو بچے دن بھر اسے گود میں لیے بھونکنا سکھاتے رہے مگر اب ان کو اس سے ذرا دور ہی رکھتا ہوں کیوں کہ جمعہ کو چھوٹے بچے نے کھیلتے کھیلتے اچانک اسے کاٹ کھایا۔ اپنے پہلے دانت سے ابھی تک پلّے کے پنسلین کے انجکشن لگ رہے ہیں۔

پروفیسر قاضی عبدالقدوس بے دودھ کی کافی کے گھونٹ لے لے کر یہ سگ بیتی سنا رہے تھے بیٹھے بیٹھے سیزر کو نہ جانے کیا ہڑک اٹھی کہ بوگن ولیا کی اوٹ سے ان کے قیمہ بھرے سموسے پر جھپٹا کافی منہ کی منہ میں رہ گئی۔ بدحواسی میں پیالی مرزا کے سر پر گری (جس سے مؤخرالذکر کئی جگہ سے چیخ گیا) اور پروفیسر مذکور گرم کافی کا غرارہ کرتے ہوئے اپنے قد سے اونچا پھاٹک پھلانگ گئے۔

مرزا نے پوچھا ''کتّے سے ڈر گئے؟''

''نہیں تو!'' وہ پھاٹک کے دوسری طرف سے بڑے خوددار لہجے میں تھرتھر کانپتے ہوئے بولے۔

ممکن ہے یہ گفتگو کچھ دیر اور جاری رہتی، مگر موضوعِ گفتگو نے ایک ہی جست میں پروفیسر قاضی عبدالقدوس کو دبوچ لیا اور ان کی سڈول ران میں اپنے نوکیلے کیلے پیوست کر دیے۔ وہ منہ پھر کر کھڑے ہو گئے چار پانچ دن پہلے بھی ایسی گھتم گتھا ہو چکی تھی کہ کبھی کتّا ان کے اوپر اور کبھی..... اور کبھی وہ کتے کے نیچے! لہٰذا ہم نے پھر بوگن ولیا کی کانٹے دار ٹہنی توڑ کر قمچی بنائی اور اس بدتمیز کو سڑاک سڑاک مارنے کو دوڑے مگر پروفیسر موصوف جہاں کے تہاں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے کہنے لگے، للہ! یہ نہ کرو۔ ابھی تو میرے پچھلے نیل بھی نہیں مٹے! جیسا کہ ہمارے پڑھنے والوں نے بھانپ لیا ہوگا، کتّا پالنا تو ایک طرف رہا، کتوں اور پروفیسر قاضی عبدالقدوس کے باہمی تعلقات کاٹنے اور کٹوانے کے کامیاب تجربات سے کبھی آگے نہیں بڑھے ورنہ ان کا علم الحیوانات اس حد تک کتابی یعنی ناقص ہے کہ ہمارے بچے جس دن بازار سے طوطے کا پہلا جوڑا خرید کر لائے تو ان سے دریافت کیا چچا جان! ان میں نر کون سا ہے اور مادہ کون سی؟ فاضل پروفیسر نے چار پانچ منٹ تک سوال اور جوڑے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر بہت محتاط انداز میں فرمایا ''بیٹا! یہ بہت طوطا چشم جانور ہوتا ہے ابھی دو تین مہینے اور دیکھو دونوں میں سے جو پہلے انڈے دینا شروع کر دے، وہی مادہ ہوگی۔'' خیر، یہ لاعلمی تو انسانی معذوری سمجھ کر پھر بھی معاف کی جاسکتی ہے کیوں کہ طوطا اپنی مادہ کو انسان کی بہ نسبت زیادہ آسانی سے پہچان لیتا ہے، لیکن ایک دن ناصحانہ انداز میں بڑے تجربے کی بہت باریک بات یہ بتائی کہ یقین مانو، کتّا رکھنے سے صحت بہتر ہو جاتی ہے! یہ سننا تھا کہ مرزا نے اتنے زور کا قہقہہ لگایا کہ تعلقات میں فوراً ابال پڑ گیا جو کئی دفعہ کافی پلانے کے بعد دُور ہوا۔

تعلقات جب ازسرِ نو اس درجہ خوشگوار ہو گئے کہ اب تبے سے گفتگو ہونے لگی تو مرزا کو تپانے کے لیے وہ پھر ثنائے سگ میں مشغول ہو گئے ایک دن موج میں آئے تو بشارت دی کہ طبی نقطۂ نگاہ سے کتا بہت مفید و مقوی جانور ہے یہ سن کر مرزا انھیں مسلمان نظروں سے دیکھنے لگے تو وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر اپنے ساتھ کے ان بیماریوں کے نام گنوانے لگے، جنھیں اس نسل نے تندرستی کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ دُور کیوں جائیں۔ خود ان کو اپنے بالشت بھر کے پلّے سے بے انتہا فائدہ پہنچ رہا تھا۔ مرزا نے کہا ''ذرا کھول کے بات کرو'' بولے، ''اب تم سے کیا پردہ، کتے کو روزانہ گوشت چاہیے۔ اور یہ ہم پر کتا پالنے کے بعد ہی منکشف ہوا کہ پہلے ہمارے گھر میں روزانہ گوشت نہیں پکتا تھا اور ہم بڑی لاعلمی میں زندگی بسر کر رہے تھے!'' ان کی بنا سپتی زندگی پر جو پردۂ غفلت چالیس سال سے پڑا ہوا تھا، اس کے دفعتہً اٹھنے بلکہ چاک ہونے کے بعد ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ اب وہ اپنی صحت سے اس قدر مطمئن ہو گئے تھے کہ ایک نمبر بڑا جوتا پہننا شروع کر دیا تھا۔ ہم تو اسے حسن اتفاق ہی کہیں گے کہ مدتوں بعد پروفیسر موصوف کی تندرستی ایک دم ایسی بحال ہوئی کہ ہمیں رشک آنے لگا اس لیے کہ اب وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ مہینے میں تین چار دن بغیر دوا کے رہ سکتے تھے مرزا کہتے تھے کہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھیں اپنے خیالی پلّے کو صبح شام دو تین میل ٹہلانا پڑتا ہے۔

اونچی ذات کے کتّوں کی صحت بخش صحبت سے پروفیسروں کی کایا پلٹ ہونا تو غیر شاعرانہ خیال آرائی ہے۔ تاہم اس کی گواہی سارا محلّہ دے گا کہ بعض احسان فراموش ہمسایوں کی گرتی ہوئی صحت پر سیزر کی موجودگی، خصوصاً اس کے بھونکنے کا نہایت خوش گوار اثر پڑا جس کا ایک ادنیٰ کرشمہ یہ تھا کہ غریب خانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے لدھڑ سے لدھڑ پڑوسی کی چال میں ایک عجیب چونکنا پن، ایک عجیب چُستی اور لپک جھپک پیدا ہو جاتی تھی۔ سیزر منٹوں کا فاصلہ لمحوں میں طے کروا دیتا تھا۔ اوروں کا کیا ذکر، خود خواجہ شمس الدین (امپورٹر اینڈ ایکسپورٹر) جو کہنے کو سیزر سے نالاں تھے، اس کے فیضانِ صحت سے اپنے کو نہ بچا سکے۔ سیٹھ صاحب موصوف کم و بیش پندرہ سال سے لو بلڈ پریشر کے لاعلاج مریض تھے۔ علاج معالجے، ٹونے ٹوٹکوں پر لاکھوں روپے صرف کر چکے تھے۔ سب بے سود، اور اب یہ نوبت آ گئی تھی کہ لالچی سے لالچی ڈاکٹر بھی انھیں اپنا مستقل مریض بنانے کے لیے تیار نہ تھا۔ مبادا انھیں روز روز مطب میں بیٹھا دیکھ کر دوسرے مریض بدک جائیں کہ اس ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا نہیں لیکن ہمارے پڑوس میں آنے کے تین مہینے کے اندر اندر نا صرف یہ کہ ان کا ''بلڈ پریشر'' بڑھ کر نارمل ہو گیا بلکہ بہ فضل اس سے بھی پندرہ بیس درجے اوپر رہنے لگا۔ ان واقعات کا تعلق اس دور ناواقفیت سے ہے جب ہم کتا پالنا کھیل سمجھتے تھے۔ کیٹل کلب کا باقاعدہ ممبر بننے کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ سیزر بے چارہ بالکل بے قصور تھا۔ غلطی سراسر ہماری ہی تھی کہ کتے کو مثل اپنی اولاد کے پال رہے تھے۔ یعنی ڈانٹ ڈانٹ کر۔ بڑے بڑے جغادریوں سے کتا پالنے کے آداب سیکھے تو پتا چلا کہ کتے کے ساتھ تو نرمی کا برتاؤ لازم ہے بلکہ اس کے سامنے بچّوں کو بے دردی سے پیٹنا نہیں چاہیے۔ ورنہ اس کی شخصیت پچک کر رہ جاتی ہے۔ اور یہاں یہ کیفیت تھی کہ گھر کے ہر فرد نے اس پر بھونک بھونک کر اپنا گلا دُکھا لیا تھا لیکن جیسے جیسے کتا بڑا ہوا، ہم میں بھی سمجھ آتی گئی اور ڈانٹ پھٹکار کا سلسلہ بند ہو گیا۔ سیزر ہی کے دم خم سے آٹھ نو سال تک ایسی بے فکری رہی کہ کبھی تالا لگانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اس کو ہمارے مال و اسباب کی حفاظت کا اس درجہ خیال تھا کہ شامت کا مارا کوئی کوا یا بلی باورچی خانے کے پاس بھی گزر جائے تو نتھنے پھلا کر اس بُری طرح کھدیڑتا کہ سارے چینی کے برتن ٹوٹ جاتے۔ گھر کی چوکیداری اور کام کاج میں اس طرح ہاتھ بٹانے کے علاوہ وہ ایک سمجھ دار کتے

کے دیگر فرائض بھی انجام دیتا رہا جن سے صاف بوئے وفا آتی تھی۔ یہی نہیں کہ وہ ناشتے پر ہمارے لیے تازہ اخبار منہ میں دبا کر لاتا بلکہ جب مہینے کی پہلی تاریخ کو اخبار والا بل لے کر آتا تو اس پر بھونکتا بھی تھا۔ اور ایک منہ میں اخبار لانے پر ہی موقوف نہیں، وہ تو کہیے، ہم نے خود دو تین دفعہ سختی سے منع کر دیا، ورنہ وہ تو ہمارے لیے توس بھی اسی طرح لا سکتا تھا۔ کھانے پر دونوں وقت وہ ہماری کہنی سے لگا بیٹھا رہتا اور حسبِ معمول ہم ہر پانچ لقموں کے بعد ایک لقمہ اسے بھی ڈال دیتے۔ اگر وہ اسے سونگھ کر چھوڑ دیتا تو ہم بھی فوراً تاڑ جاتے کہ ہو نہ ہو کھانا باسی ہے۔ غرض کہ بہت ہی ذہین اور خدمتی تھا۔

وقت گزرتا دکھائی نہیں دیتا مگر ہر چہرے پر ایک داستان لکھ جاتا ہے کل کی سی بات ہے جب سیزر بچہ سا آیا تھا تو پروفیسر قاضی عبدالقدوس جو سدا سے یک رنگی کے قائل ہیں، اتوار کے اتوار موچنے سے اپنے سر کے سفید بال اکھاڑا کرتے تھے۔ بال وہ اب بھی اکھاڑتے تھے، مگر صرف کالے۔ (انھیں خود بھی اپنی عمر کا احساس ہو چلا تھا اور غالباً اسی رعایت کے تحت اب صرف بال بچوں والی عورتوں پر ان کی طبیعت آتی تھی)۔ نادان بچوں کی وہ پہلی کھیپ جس نے سیزر کے ذریعے انگریزی سیکھی، اب ماشاءاللہ اتنی سیانی ہو چکی تھی کہ اردو اشعار کا صحیح مطلب سمجھ کر شرمانے کے قابل ہو گئی۔ سیزر بھی رفتہ رفتہ خاندان ہی کا ایک معمر رکن بن گیا..... اس لحاظ سے کہ اب اس کا کوئی نوٹس نہیں لیتا ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ بوڑھا ہو گیا اور ساتھ ہی ساتھ دل میں اس کے لیے رفاقت و ہم سفری کا ایک احساس، دردمندی و ہم نصیبی کا ایک رشتہ ہو چلا کہ ہم نے ایک دوسرے کو بوڑھا ہوتے دیکھا تھا۔ ایک ساتھ وقت سے ہار مانی تھی۔

آج اس کی ایک ایک بات یاد آ رہی ہے۔ جوان تھا تو راہ چلتوں کا پنجے جھاڑ کر ایسا پیچھا کرتا کہ وہ گھگھیا کر قریب ترین گھر میں گھس جاتے اور بے آبرو ہو کر نکالے جاتے۔ وہ تاک میں رہتا اور نکلتے ہی ان کے منہ اور گردن کو ہر دفعہ باندازِ دیگر یوں بھنبھوڑتا گویا جانور نہیں، کسی انگریزی فلم کا ندیدہ ہیرو ہے یہ مرزا کے الفاظ ہیں۔ (کہتے ہیں انگریزی فلموں میں لوگ یوں پیار کرتے ہیں جیسے تخمی آم چوس رہے ہیں) ابھی تین سال پہلے تک اسے دیکھ کر پڑوسیوں کا چلّو ؤں خون سوکھتا تھا مگر اب اتنا ضعیف ہو گیا تھا کہ دن بھر بوگن ولیا کے نیچے کسی مرشد کاہل کی طرح مراقبے میں پڑا رہتا بہت ہوا تو وہیں سے لیٹے لیٹے دم ہلا کر شفقت کا اظہار کر دیا۔ البتہ چھوٹے بچوں کو، خواہ گھر کے ہوں یا پاس پڑوس کے، اس نے کبھی مایوس نہیں کیا۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی بچہ اسے آواز دے کر گیند پھینکے اور وہ گودا بھری نلی چھوڑ چھاڑ، گیند اپنے منہ میں رکھ کر واپس نہ لائے۔ اس معاملے میں اسے بچوں کی تالیف قلوب اس درجہ عزیز تھی کہ کئی دفعہ فٹ بال تک منہ میں رکھ کر لانے کی کوشش کی۔ اعضاء و جوارح رفتہ رفتہ جواب دے رہے تھے۔ ساری تن پھن غائب، غرّش ختم، مرزا کے الفاظ میں اس کا بڑھاپا شباب پر تھا۔ کسی کسی دن سہ پہر تک بوگن ولیا کی چھاؤں میں وہی سنسنی خیز اردو اخبار اوڑھے اونگتا رہتا، جس میں نوکر صبح قیمہ بندھوا کر لاتا تھا۔ چاندنی اور ماداؤں کی مست مہک سے اب اس کے خون میں جوار بھاٹا نہیں آتا تھا۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ ''گرمی'' پر آتا تو سرِ شام ہی سے زنجیر تڑا کر قدِ آدم دیوار پھاند جاتا اور فجر کی اذان کے وقت شاد کام لوٹتا۔ یا اب اس جواں دیدہ بزرگ کا یہ حال ہو گیا تھا کہ گرمائی ہوئی مادہ اور ہڈی بہ یک وقت نظر آ جائیں تو ہڈی ہی پر جھپٹتا تھا اور جب اس ہڈی کو پپولتے پپولتے اس کے بوڑھے جبڑے دکھنے لگتے تو اسے سرخ بوگن ولیا کے نیچے دفن کر کے وضو کے لوٹے میں منہ ڈال کر پانی پینے چلا جاتا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ

وہی سیزر ہے جس کے جبڑے کی مہر محلے کے ہر تیسرے آدمی کی پنڈلی پر آج تک گواہی دے رہی ہے۔

اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

وہی دُم جو ایک زمانے میں بہ قول شخصے سوالیہ نشان کی طرح کھڑی رہتی تھی، اب مفلس کی مونچھ کے مانند لٹکنے لگی۔ اس کے ہم عمر ایک ایک کر کے وہ گلیاں سونی کر گئے، جہاں سے راتوں کو اَن دیکھے بھید بھرے جسموں کی خوشبوؤں کے بُلاوے آتے تھے۔ وہ تنہا رہ گیا۔ بالکل تنہا و دل گرفتہ۔ نئی پود کے منہ زور کتّوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا تو درکنار، وہ ان کے نو دولتیے مالکوں پر بھونکنا بھی اپنے رتبے کے منافی سمجھتا تھا لیکن جس دن سے ماتا ہری کی جوان پٹھور بیٹی کلو پٹرا بھری دوپہر میں ایک حلوائی کے بے نام کتّے کے ساتھ بھاگی، وہ ہفتوں اپنے ہم جنس کی آواز تک کو ترسنے لگا۔ جب تنہائی سے بہت جی گھبرانے لگا تو ریڈیو کے پاس آ کر بیٹھ جاتا اور پکّے گانے سن کر بہت خوش ہوتا۔ جسم کے ساتھ ساتھ نظر بھی اتنی موٹی ہو گئی تھی کہ کبھی پروفیسر عبدالقدوس اجلے کپڑے پہن کر آ جاتے تو انھیں اجنبی سمجھ کر بھونکنے لگتا۔ البتہ سماعت میں فرق نہیں آیا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اٹکل سے گیند کا پیچھا کرتا ہے اور اس کے ٹپّہ کھانے سے اس کی سمت اور محلِ وقوع کا اندازہ کر لیتا ہے ایک دن شام کو اچھا خاصا بوگن ولیا کے نیچے اپنا مخصوص آسن مارے (دائیں آنکھ، جو بچپن سے سرخ رہتی تھی، آدھی بند کیے، بائیں پنجے پر تھوتھنی رکھے) بیٹھا تھا کہ ایک نیلے ربن والی بچّی نے "شو" کہہ کر سڑک پر پنگ پانگ کی گیند پھینکی، وہ آواز کی سیدھ پر لپکا، مگر جیسے ہی گیند منہ میں پکڑ کر تیزی سے پلٹا، ایک کار کے بریک لگنے کی دل خراش آواز سنائی دی۔

بچّے چیختے ہوئے دوڑے۔ سڑک پر دور تک ٹائروں کے گھسنے سے دو سیاہ پٹیاں بن گئیں۔ کار ایک دھچکے کے ساتھ رکی اور اپنے اسپرنگوں پر دو تین ہچکولے کھا کر غرّاتی ہوئی تیزی سے پہلے ہی موڑ پر مڑ گئی۔ مگر سیزر بیچ راستے ہی میں رہ گیا۔ اس کا پچھلا دھڑ کار کا پورا وزن سہار چکا تھا۔ منہ سے تیزی سے خون جاری تھا۔ اور پاس ہی گیند پڑی تھی۔ جواب سفید نہیں رہی تھی۔

سب نے مل کر اسے اٹھایا اور پھاٹک کے پاس بوگن ولیا کے نیچے لٹا دیا۔ لگتا تھا، شریانوں کے منہ کھل گئے ہیں۔ اور اس کی زندگی دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ رِس رہی ہے۔ ضرب بہ ضرب، قطرہ بہ قطرہ، دم بہ دم۔ ہر ایک اسے چھو چھو کر انگلیوں کی پوروں سے دل کی دھڑکن سن رہا تھا..... وہ دھڑکن جو دوسری دھڑکن تک ایک نیا جنم، ایک نئی جون بخشتی ہے۔ کس جی سے کہوں کہ اس کا آب و دانہ اُٹھ چکا تھا۔ اور وہ رخصت ہو رہا تھا۔ اس ہمت، اس حوصلے، اس سکون کے ساتھ، جو صرف جانوروں کا مقدر ہے۔ بغیر کراہے بغیر تڑپے، بغیر ہراساں ہوئے۔ بس بے نور نظریں جمائے دیکھے چلا جا رہا تھا۔ باری باری سب نے اسے چُمکارا۔ سر پر ہاتھ رکھتے ہی وہ آنکھیں جھکا لیتا تھا۔ اور یہ یاد کر کے سب کی آنکھیں بھر آئیں کہ اس کی زندگی میں آج پہلا موقع تھا کہ سر پر ہاتھ پھروا تے وقت وہ جواباً اپنی ریشم سے ملائم دم نہیں ہلا سکتا تھا۔ آج اس کے نتھنوں میں ایک اجنبی خون کی بُو گھسی جا رہی تھی۔ کوئی آدھ گھنٹہ گزرا ہو گا کہ چار پانچ کوّے اوپر منڈلانے لگے اور دھیرے دھیرے اتنے نیچے اُتر آئے کہ ان کے منحوس سائے اس پر پڑنے لگے۔ کچھ دیر بعد احاطے کی دیوار پر آ بیٹھے اور شور مچانے لگے سیزر نے ایک نظر اُٹھا کر انھیں دیکھا۔ ایک لحظے کے لیے اس کے نتھنے پھڑک اٹھے۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ ہم سے یہ نہ دیکھا گیا۔ اس کا خون آلود منہ کھول کر سونے کی گولیوں کی شیشی حلق میں اُلٹ

دی اور کالر اتار دیا۔ ذرا دیر بعد وہ اپنے پیار کرنے والوں کی دھندلاتی صورتیں دیکھتا دیکھتا ہمیشہ کے لیے سو گیا!

مارچ کے چڑھتے چاند کی بھیگی بھیگی روشنی میں جب بچّوں نے مل کر اس کی محبوب بوگن ولیا کے نیچے زمین کی امانت زمین کو سونپنے کے لیے گہرا سا گڑھا کھودا تو چھوٹی بڑی بے شمار ہڈیاں نکلیں، جنھیں وہ غالباً دفن کر کے بھول گیا تھا۔ دُور دُور تک بوگن ولیا کی لمبی لمبی انگلیوں جیسی جڑیں اپنا راستہ ٹٹولتی ہوئی زمین کے نیم گرم سینے میں اُترتی چلی گئی تھیں اور اس کا رس چوس چوس کر شاخوں کے سروں پر دہکتے ہوئے پھولوں تک پہنچا رہی تھیں مگر سوکھی پیاسی جڑوں کو آج سیزر کے لہو نے ان پھولوں سے بھی زیادہ سرخ کر دیا ہوگا جو بچّوں نے لحد کا منہ اپنی سلیٹوں اور تختیوں سے بند کر کے اوپر بکھیر دیے تھے۔ آخر میں نیلی ربن والی بچّی نے اپنی سال گرہ کی موم بتّیاں سرہانے روشن کر دیں ان کی اُداس روشنی میں بچّوں کے مَیلے گالوں پر آنسوؤں کی نمکین اُجلی لکیریں صاف چمک رہی تھیں۔

کئی مہینے بیت گئے، پت جھڑ کے بعد بوگن ولیا پھر انگارے کی طرح دہک رہی ہے مگر بچّے آج بھی اس جگہ کسی آدمی کو پاؤں نہیں رکھنے دیتے کہ وہاں ہمارا ایک ساتھی سو رہا ہے۔

☆☆☆

باسکرولی کا آتشی کتا

کتاب گھر آپ کے لئے لایا ہے مشہور سراغ رساں شرلاک ہومز کا ناول ''باسکرولی کا آتشی کتا''۔ یہ ناول مشہور رائٹر سر آرتھر کونن ڈائل کی شہرہ آفاق کتاب "The Hound of Baskervilles" کا اردو ترجمہ ہے۔ ۱۹۰۲ء میں تحریر کئے گئے اس ناول پر اب تک ہالی وڈ کی کئی فلمیں اور ڈرامے بن چکے ہیں۔ سر آرتھر نے شرلاک ہومز کا کردار اٹھارویں صدی میں متعارف کروایا تھا لیکن اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کر لیں کے ایک صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود یہ کردار جاسوسی ناول پڑھنے والوں میں آج بھی اتنا ہی مقبول ہے۔ اس ناول کو کتاب گھر کے **جاسوسی ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ہم زلف

شوکت تھانوی

''بہرے کہیں کے!''

بھرے چوک میں جب کوئی شخص اس بے تکلفی کے ساتھ شانہ پر ہاتھ رکھ دے تو اس کے معنی یہی ہوئے کہ وہ یقیناً اس بے تکلفی کا مستحق ہوگا۔ لیکن ہم سے قسم لے لیجیے جو ہم ان حضرت کو جانتے بھی ہوں، جنہوں نے ہم کو بہرہ بھی بنایا تھا اور بھرے بازار میں کندھے پر ہاتھ بھی رکھا تھا۔ ہم تو اُن کو پہچاننے کی کوشش میں تھے، لیکن وہ برابر نہایت بے تکلفی کے ساتھ ہم کو اپنا ''جملہ حقوق محفوظ'' قسم کا عزیز سمجھے جا رہے تھے اور اپنے ہر انداز سے یہ ثابت کر رہے تھے کہ ہمارا اور اُن کا رشتہ تکلف اور دنیاوی مراسم سے بالاتر ہے۔ چنانچہ انہوں نے ہم کو اپنی طرف کھینچ کر نہایت پیار سے کہا،

''خدا کی قسم! تم ہو بڑے بے مروت، یعنی کبھی تو بھول کر ہم غریبوں کو بھی یاد کر لیا کرو۔''

ہم اب تک یاد نہ کر سکے، یہ ہیں کون بزرگ اور اِن سے ہمارا کیا رشتہ ہے۔ اگر ہم صاف صاف یہ کہے دیتے ہیں کہ ہم نے آپ کو نہیں پہچانا تو ممکن ہے برا مان جائیں، اس لیے کہ ان کے برتاؤ سے کم از کم یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اور اُن کے درمیان جو رشتہ ہے وہ کم از کم بھولنے والا نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ جب ہم ان حضرت کو جانتے ہی نہ تھے تو اس کی ہم کو کیا خبر ہو سکتی تھی کہ ان سے رشتہ کیا ہے اور اِس علم کے بغیر ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہم ان کو کس رُخ سے مخاطب کریں اور گفتگو کا کیا طریقہ رکھیں۔ لیکن بہت کچھ غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ چاہے جو کچھ بھی ہو، ہم یہ ہرگز نہیں کہیں گے کہ ہم نے آپ کو نہیں پہچانا، البتہ ہم ان سے گفتگو میں احتیاط ضرور رکھیں گے کہ ہماری لاعلمی ثابت نہ ہو۔ ہم تو خیر اِس اُدھیڑ بن میں پڑے ہوئے تھے، لیکن وہ ہم کو پہچان چکے تھے، لہٰذا انہوں نے آزادی کے ساتھ ہم سے باتیں شروع کر دیں:

''بھائی، بات اصل میں یہ ہے کہ تم بھی اپنے کاموں میں مصروف ہو اور اِدھر ہم کو بھی دَم لینے کی مہلت نہیں، مگر بھائی ایسا بھی کیا، کبھی کبھی تو صورت دکھا دیا کرو۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہزاروں کوس کے فاصلے پر ہیں۔''

ہم نے سنبھلتے ہوئے عرض کیا، ''بھائی صاحب بات یہ ہے کہ فرصت سے سب کچھ ہوتا ہے۔''

کہنے لگے، ''یہ تو میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ اپنے افکار جب چھوڑیں تو عزیز رشتہ دار بھی یاد آئیں۔ نہیں تو کیسے عزیز اور کیسے رشتے دار۔ کچھ گھر ہی کے جھگڑوں سے چھٹکارا نہیں ہوتا۔''

ہم نے پوچھا، ''اچھا گھر میں سب خیریت تو ہے؟''

کہنے لگے، ''ارے بھائی، کیا خیریت پوچھتے ہو۔ اپنی سالی کے متعلق تو تم جانتے ہی ہو کہ ہمیشہ کی مریض ہیں۔ بخدا جس دن سے شادی کر کے لایا ہوں آج تک تو اُن کو تندرست دیکھا نہیں۔ رہ گئے بچے، ان کا کیا پوچھنا، بیمار ماں کے بیمار بچے بھی قابلِ رحم ہوتے ہیں۔''

اب ہم کو معلوم ہوا کہ یہ حضرت ہمارے ہم زلف ہیں۔ ہم نے اپنے تمام رشتہ داروں پر خیال دوڑایا، لیکن ان میں بھی ان ہم زلف صاحب کا کہیں پتا نہ تھا۔ ہم نے سوچا کہ یہ حقیقی ہم زلف نہیں، کسی رشتہ کی سالی کے شوہر ہوں گے۔ بہر حال، ہیں ضرور ہم زلف، لہٰذا ہم نے جواب دیا، ''ہاں صاحب ان کی صحت تو ہمیشہ سے خراب ہے، خداوند کریم ان کو صحت عطا فرمائے۔''

''ایک دن کی بیماری ہو تو کہا جائے، ہم ان کو ہمیشہ سے بیمار اور اپنے کو تیماردار دیکھ رہے ہیں۔ اور اِسی پر کیا منحصر ہے، والدہ صاحبہ کے بھی بس آخری دن سمجھو۔''

ہم: ''اجی خدا نہ کرے، ان کا دم بھی غنیمت ہے۔ خداوند کریم ان کا سایہ ہم سب پر قائم رکھے۔''

وہ: ''نہیں بھائی، ہم تو دعا مانگتے ہیں کہ ان کا خاتمہ بالخیر ہو جائے، ان کی تکلیفیں اب دیکھی نہیں جاتیں۔''

ہم: ''اللہ رحم کرے۔''

وہ: ''سنا تھا کہ تمھارے گھر میں بھی کچھ طبیعت ناساز ہے۔ اب کیا حال ہے؟''

ہم: ''بفضلہٖ اب تو اچھی ہیں، سب کو یاد کرتی ہیں۔''

وہ: ''خود اُن کی بہن ان کو دیکھنے کے لیے بے قرار ہیں۔ کسی دن تم ہی لے آؤ اور ہاں، محمودہ کا کیا حال ہے؟''

یہ نام ہمارے لیے بالکل نیا تھا، لیکن یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ کون محمودہ؟ لہٰذا ہم نے جواب دیا۔ ''اچھی ہیں وہ بھی۔''

وہ: ''اچھا میری طرف سے پیار کرنا اور کہہ دینا کہ تیرا خالو تجھ سے خفا ہے۔ تو نے اس کو کبھی خط بھی نہ بھیجا۔ جیتی رہے اللہ کرے۔''

ہم: ہنس کر چپ ہو رہے۔

وہ: ''ارے بھائی، اور بھی کچھ سنا کہ محسن بھائی کی بیگم صاحبہ کیا رنگ لائیں۔''

ہم: (حیرت سے) ''کیا ہوا؟ ہم نے کچھ نہیں سنا۔''

وہ: (چپکے سے) ''خاندان بھر کی گویا ناک جڑ سے اُڑا دی۔ اس کے تو ڈھنگ اوّل دن ہی سے ایسے تھے کہ خود تم نے کہا تھا کہ خدا خاندان کی عزت رکھ لے۔ چنانچہ وہی ہوا کہ پہلے تو گھر ہی میں خاندان کا نام ڈبویا، لیکن آج چار دن سے بالکل لاپتا ہیں، کیا کہا جائے۔ اللہ، مر جانے کو جی چاہتا ہے۔''

ہم: ''مگر کچھ شبہ بھی ہے کہ آخر گئیں کہاں؟''

وہ: ''ارے بھائی، شبہ کیا بلکہ یقین ہے، لیکن زبان سے نہیں نکلتا۔ جہاں تک خیال ہے، اُسی درزی کے یہاں ہیں، جس سے بہت دنوں سے پینگ بڑھائے ہوئے تھیں۔ اب بتاؤ کہ یہ بات زبان سے نکالنے والی ہے، مگر خدا کے لیے اپنے ہی تک رکھنا۔''

ہم: ''توبہ ہے۔ واقعی توبہ کرنے کا مقام ہے، کیسا اس کم بخت نے خاندان کی عزت پر پانی پھیرا ہے۔''

وہ: ''ہمارے بھائی صاحب قبلہ کو دیکھیے کہ گویا کوئی بات ہی نہیں۔ اور کوئی ہوتا تو سنکھیا کھا لیتا۔''

ہم: ''اس چڑیل کی ناک کاٹ لینا چاہیے تھی۔''

وہ: ''تم ناک کہتے ہو، میں کہتا ہوں گولی مار دینا تھی۔''

ہم: ''کاش یہ دن آنے سے پہلے طلاق ہی دے دی ہوتی۔''

وہ: ''کیا کیا جائے بھائی، ہمارا تو یہ حال ہے کہ محلّہ میں کسی سے آنکھیں چار کرنے قابل نہیں رہ گئے۔ ہر ایک یہی کہے گا کہ یہ اغوا شدہ بھاوج کے دیور ہیں۔''

ہم: ''واقعی تمھارے لیے مرجانے کا مقام ہے۔''

وہ: ''کیا کریں موت سے مجبور ہیں، ورنہ اس زندگی سے واقعی موت اچھی تھی۔''

ہم نے گفتگو کا رُخ بدلنا چاہا، اس لیے کہ اس غریب کی شرمندگی سے اب ہم کو بھی تکلیف ہو رہی تھی، لہٰذا ہم نے کہا، ''خیر بھائی، اب چھوڑو اِس قصے کو، اب بتاؤ کہ آج کل آمدنی کا کیا حال ہے؟''

کہنے لگے، ''آمدنی کیا، وہی گنی بوٹی نپا شور بہ۔ پہلی تاریخ کو مقررہ تنخواہ، بالائی آمدنی کا پتا نہیں، اور تم کہو دکان کیسی چل رہی ہے؟''

ہمارے باوا آدم سے لے کر اَب تک کسی نے دکان نہیں کی تھی، لہٰذا اِس سوال کا کیا جواب دے سکتے تھے، لیکن چوں کہ ہمارے ہم زلف نے یہ سوال کیا تھا، لہٰذا ظاہر ہے کہ سوال غلط نہیں ہوسکتا تھا، اس لیے ہم نے جواب دیا، ''آج کل بڑے سناٹے ہیں''۔

وہ: ''آج کل ہر کاروبار کا یہی حال ہے، پھر کپڑے کی تجارت تو واقعی آج کل ٹھنڈی پڑی ہے۔''

معلوم ہوا کہ ہماری دکان کپڑے کی ہے۔ لہٰذا ہم نے کہا، ''تمام دن ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہتے ہیں۔ اوّل تو گاہک آتے ہی نہیں اور آئیں بھی تو کانگریس کے والنٹیر آنے نہیں دیتے۔ اب دن بھر کے تھکے ماندے گھر جا رہے ہیں۔ نہ لینا ایک نہ دینا دو، بلکہ اور گرہ سے خرچ ہو جاتا ہے۔''

وہ: ''اچھا بھائی، اب جاؤ گھر میں آرام کرو۔ تم سے مل لیے بڑی خوشی ہوئی، مگر کسی دن گھر پر ضرور آؤ۔ تمھاری سالی کہا کرتی ہیں کہ ''اقتدار بھائی'' نے تو آنا ہی چھوڑ دیا۔''

اب ہم کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہم ''اقتدار بھائی'' ہیں، لہٰذا دل چاہا کہ کہہ دیں کہ ہم ''اقتدار بھائی'' نہیں ہیں، لیکن پھر ہم نے سوچا کہ غریب بہت شرمندہ ہوگا۔ اگر اِس کو رات کے وقت مغالطہ ہوا ہے تو تم بھی ہم زلف بنے رہو۔ رشتہ ایسا ہے کہ کسی طرح گھاٹے میں نہیں ہو، لہٰذا ہم نے کہا، ''اچھا بھائی، سلام علیکم۔''

ہمارے راہ گیر ہم زلف صاحب نے بھی خدا حافظ کہا اور چل دیے۔ خیریت یہ ہوئی کہ ہمارے کسی شناسا نے ہمارا نام لے کر نہیں پکارا، لیکن اس میں بھی کوئی مضائقہ نہ تھا۔ ہم کہہ دیتے کہ ہمارا یہ تخلص ہے!

☆☆☆

مِس چنبیلی

کنہیالال کپور

برسوں ادبی رسائل میں مضامین لکھتے رہے، مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ ہم بھی ادیب ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ دو چار ایڈیٹروں سے واقفیت ہوگئی اور اُن کے تقاضوں نے ناک میں دَم کر دیا۔ یا کچھ ادبی قسم کے لوگ جو ہمیں پہلے ہی سے جانتے تھے، اب ذرا اچھی طرح جان گئے کہ اگر کسی ایسی مجلس میں مدعو کیے گئے جہاں شہر کے شرفا و رؤسا بھی موجود تھے اور کسی شخص نے ازراہِ ہمدردی ہمارا تعارف ان سے کرایا تو استقبال اس قسم کے کلمات سے کیا گیا:

''مرزا اُزبک.....! کون اُزبک! کہیں وہی تو نہیں، جن کے پان بہت مشہور ہیں۔ اچھا، کبھی چونا منڈی سے گزرنے کا اتفاق ہوا تو ضرور اِن کے پان بھی کھائیں گے۔''

''اچھا، تو یہ ہیں مرزا اُزبک! بخدا! شکل وصورت سے بالکل اُزبک ہی نظر آتے ہیں۔''

''مشہور ادیب ہیں، ہم نے تو اِن کا نام پہلی بار سنا ہے۔''

آخر ایک دن جو اپنی گم نامی کا تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ قصور اپنا ہی ہے۔ ادبی رسائل میں لکھنا پرلے درجے کی حماقت تھی۔ اوّل تو ادبی رسائل کی اشاعت ہی کتنی ہوتی ہے اور پھر انھیں خریدتا اور پڑھتا کون ہے؟ چند شعرا اور اُدبا جنھیں رسالہ مفت بھجوایا جاتا ہے، یا کالج کے کچھ ذہین طلبہ جنھیں غزلیں اور نظمیں پڑھنے کا شوق ہوتا ہے۔ دراصل ادبی مضامین خشک بھی تو اتنے ہوتے ہیں کہ ان کے عنوانات پڑھنے کے بعد ہی لاحول پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ چنانچہ فیصلہ کیا کہ آئندہ صرف عوامی رسائل ہی میں لکھا کریں گے۔

اتفاق سے پتا چلا کہ بمبئی کا مشہور فلمی رسالہ ''فلم باز'' اپنا ایکٹرس نمبر نکال رہا ہے۔ ہم نے فوراً ایک مضمون لکھا۔ عنوان تھا، ''مِس چنبیلی سے ایک ملاقات''۔ چند دنوں کے بعد ایڈیٹر صاحب کا خط آیا:

''مضمون بہت پسند آیا۔ مبلغ پچاس روپے کا چیک بطورِ معاوضہ بھجوا رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ آئندہ بھی ''فلم باز'' کی سرپرستی فرماتے رہیں گے۔ ہاں، اپنی فوٹو بھی ضرور عنایت کیجیے گا۔''

چیک کو دیکھ کر باچھیں کھل گئیں اور بے اختیار منہ سے نکلا، ''واللہ ہم بھی کتنے سادہ لوح تھے کہ ادبی رسائل میں لکھتے رہے۔ اگر شروع سے ہی ''فلم باز'' میں لکھتے تو آج خاصے مال دار ہوتے۔'' ادبی مضامین کا اِس فلمی مضمون سے موازنہ کیا تو پتا چلا کہ جہاں ایک ادبی مضمون کے لیے گھنٹوں مغز پچی کرنا پڑتا ہے، وہاں ایک فلمی مضمون منٹوں میں لکھا جا سکتا ہے۔ ''مِس چنبیلی سے ایک ملاقات'' کو ہی لیجیے۔ لکھا ہی کیا تھا ہم نے اس میں..... یہی کہ.....

''بوٹا سا قد، چھریرا بدن، خوبصورت ناک نقشہ، مِس چنبیلی واقعی مِس چنبیلی ہے..... وہ ایک نہایت پُر اسرار ایکٹرس ہے۔ اسے کالی بلیوں اور بھورے رنگ کے خرگوشوں سے والہانہ محبت ہے۔ وہ اپنی جلد کی خوبصورتی برقرار رکھنے کے لیے دیسی صابن کا استعمال کرتی ہے۔ اس کے دانت موتیوں کی طرح سفید ہیں، کیوں کہ وہ ایک تیز چاقو سے انہیں ہر وقت کھرچتی رہتی ہے۔ اسے عطرِ حنا بالکل پسند نہیں۔ ایک دفعہ اُس نے غلطی سے عطرِ حنا سونگھ لیا تھا اور وہ بیہوش ہوگئی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد اُسے پتا چلا کہ وہ عطرِ حنا نہیں تھا، کلوروفارم تھا۔

مِس چنبیلی عموماً شام کا کھانا صبح اور صبح کا کھانا شام کے وقت کھاتی ہے۔ آلو، ٹماٹر، گوبھی اور بیگن کے علاوہ اسے کوئی ترکاری پسند نہیں۔ اسے ہوائی جہاز چلانا بالکل نہیں آتا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ اِس شخص سے شادی کرے گی جو بہت اچھا ہوا باز ہو۔ کھوٹے سکے، خالی بوتلیں اور مٹی کے لوٹے اکٹھا کرنے کا اُسے بے حد شوق ہے۔ وغیرہ وغیرہ.....''

اس مضمون کا چھپنا تھا کہ سارے شہر میں تہلکہ سا مچ گیا۔ جسے دیکھو ''فلم باز'' کا ایکٹرس نمبر ہاتھ میں لیے مبارک باد دینے چلا آرہا ہے۔ ''واہ، اُزبک صاحب واہ! خوب مضمون لکھا ہے۔ واللہ لطف آ گیا۔ کیا انکشاف فرماتے ہیں۔ سبحان اللہ، مضمون کیا لکھا ہے، قلم توڑ کر رکھ دیا ہے۔''

اُنہی دنوں کی بات ہے کہ ایک شام ہم پان کھانے کے لیے کتھامل چونامل کی دکان پر رُکے۔ ہم نے دیکھا کہ دونوں پنواڑی ہمیں دیکھ کر آپس میں کھُسر پھُسر کر رہے ہیں۔ ایک آدھ منٹ کے بعد کتھامل نے ذرا اونچی آواز میں کہا، ''تو تم ہی پوچھ لو نا۔ شرماتے کیوں ہو؟''

ہم نے پوچھا، ''کیا بات ہے بھئی؟''

چونامل نے ڈرتے ڈرتے کہا، ''جی ایک بات پوچھنا تھی۔''

''کہیے۔''

''آپ مرجا اُجبک ہیں نا؟''

''جی ہاں، میں مرزا اُزبک ہوں۔''

''ہی ہی ہی۔ آپ کی فوٹو ''فلم باج'' میں دیکھی تھی۔ وہ مجمون..... چنبیلی پر..... آپ نے لکھا تھا؟''

''ہاں صاحب، ہم نے لکھا تھا۔''

''ہی ہی ہی، بہت اچھا مجمون ہے۔ ہم نے اسے پڑھا تھا۔ چنبیلی بہت اچھا کام کرتی ہے۔ ہم نے اپنی دکان میں چنبیلی ہی کی تصویریں لگا رکھی ہیں۔''

ہم نے دیکھا کہ اس کی دکان میں واقعی چنبیلی ہی چنبیلی نظر آتی ہے۔ پیسے دینے کے لیے بٹوا نکالا ہی تھا کہ کتھامل نے ہمیں منع کرتے ہوئے کہا، ''نا صاحب نا..... ایسا نہ کیجیے..... ہم آپ سے پیسے نہیں لے سکتے۔''

''لیکن کیوں؟'' ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اجی رہنے دیجیے۔ آپ اتنے بڑے آدمی ہیں۔ مِس چنبیلی کو جانتے ہیں۔ آپ سے بھلا کیسے.....''

بہت اصرار کیا، لیکن وہ نہ مانا بلکہ کہنے لگا، ''آئندہ بھی جب کبھی پان کا شوق فرمانا ہو، ہمیں یاد فرمایئے گا۔''

پان چباتے ہوئے سڑک پر جا رہے تھے کہ اچانک ایک حوالدار نے ہمیں پکار کر کہا، ''اجی اُزبک صاحب! ذرا ٹھہریے تو۔''

حوالدار کو دیکھ کر ہمارا کلیجا دھک سے ہو گیا۔ خدا خیر کرے، کہیں اس کے پاس ہماری گرفتاری کا وارنٹ تو نہیں ہے۔ کہیں اسے ہم پر جیل سے بھاگے ہوئے کسی مجرم کا شبہ تو نہیں ہوا۔

حوالدار صاحب نے کہا، ''میں پرسوں سے آپ کو تلاش کر رہا ہوں۔ اچھا ہوا آپ اتفاقاً مل گئے۔''

''لیکن حوالدار صاحب ہم نے..... ہمارا مطلب ہے..... کہ.....''

''اجی اُزبک صاحب'' حوالدار صاحب نے ہماری بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا، ''آپ نے تو کمال کر دیا۔ وہ مضمون جو آپ نے لکھا ہے چنبیلی پر، بخدا چار دفعہ پڑھ چکا ہوں اور اتنی ہی بار اور پڑھنے کا ارادہ ہے۔''

مضمون کا ذکر سن کر جان میں جان آئی۔ وہ فرمانے لگے، ''آیئے نا، ذرا غریب خانے تک، چائے پئیں گے اور ساتھ ہی آپ سے مِس چنبیلی کے بارے میں کچھ اور تفاصیل سنیں گے۔''

میرے انکار کے باوجود وہ مجھے اپنے ہاں لے گئے۔ چائے پینے کے دوران میں پوچھنے لگے۔ ''اُزبک صاحب! یہ جو آپ نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ایک بار مِس چنبیلی نے ایک چور پکڑا تھا۔ کیا یہ درست ہے؟''

''جی ہاں! بالکل درست۔''

''لیکن وہ چور کون تھا؟''

''چور کہاں تھا قبلہ، وہ تو ایک فاقہ زدہ شاعر تھا۔''

''فاقہ زدہ شاعر؟''

''جی ہاں، بے چارہ گھر سے بمبئی آیا تھا کہ فلموں کے گانے لکھے گا، لیکن آپ جانتے ہیں کہ بمبئی میں واقفیت کے بغیر کام کہاں ملتا ہے۔ وہ ایک مہینے اسٹوڈیو کی خاک چھانتا رہا۔ اِس اثنا میں جو پونجی گھر سے لایا تھا، ختم ہو گئی۔ آخر ایک دن اس نے چوری کرنے کی ٹھانی..... ایک کند سی تلوار لے کر رات کے ایک بجے مِس چنبیلی کے کمرے میں داخل ہوا۔''

''پھر.....؟''

''اچانک مِس چنبیلی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ شب خوابی کے لباس میں اٹھ کھڑی ہوئی اور شاعر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی، آپ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں، شوق سے کیجیے:

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

دراصل یہ ایک فلم کا ڈائیلاگ تھا جو مِس چنبیلی کو بروقت یاد آ گیا۔ بس صاحب، شاعر نے جب یہ ڈائیلاگ سنا تو عش عش کرنے لگا۔ تلوار

اُس کے ہاتھ سے گر پڑی اور اُس کے منہ سے نکلا:

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مِس چنبیلی نے کمال صفائی سے وہ کند تلوار اٹھائی اور شاعر پر وار کیا۔ بھوک سے تو وہ پہلے ہی نڈھال ہو رہا تھا، فوراً زمین پر آ رہا۔ مِس چنبیلی نے گھنٹی بجائی اور اُس کے ملازم نے شاعر کی مشکیں کس دیں۔ صبح اسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔"

"خوب..... خوب..... کمال کی دلیری دکھائی مِس چنبیلی نے۔"

"جی ہاں۔"

"اچھا، آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک دفعہ مِس چنبیلی نے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دی تھی، وہ کیا قصہ تھا؟"

"صاحب یہ قصہ ذرا طویل ہے، پھر کبھی عرض کروں گا۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔"

رات کے وقت جب گھر لوٹے تو ہمارے ہمسائے ڈاکٹر منوہر لال صاحب تشریف لائے۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے، "قبلہ اُزبک صاحب! آپ تو چھپے رستم نکلے۔ یہ آپ نے لکھنا کب سے شروع کر دیا؟ ہم تو سمجھے تھے کہ آپ محض معلم ہیں، لیکن آپ تو اچھے خاصے ادیب بھی ہیں۔"

"قدر افزائی کا بہت بہت شکریہ۔ ادیب تو کیا ہوں، یوں ہی مشغلے کے طور پر کبھی کبھار لکھا کرتا ہوں۔"

اچھا اُزبک صاحب، یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ مِس چنبیلی صبح کا کھانا شام کو اور شام کا کھانا صبح میں کھاتی ہے۔ اِس سے مِس چنبیلی کو بدہضمی کی شکایت تو نہیں ہو جاتی ہے؟"

"قبلہ، یہ سب عادت پہ منحصر ہے، عادت اور مشق پر..... ہمارا تو خیال ہے کہ اگر کوئی شخص تھوڑی سی مشق کر لے تو کچھ عرصے کے بعد اُسے صبح شام میں امتیاز کرنا مشکل ہو جائے گا۔"

"بہر حال میڈیکل نقطۂ نگاہ سے....."

"میڈیکل نقطۂ نگاہ کو رہنے دیجیے۔ یہ فلم لائن ہے۔ اس میں سب کچھ چلتا ہے۔"

چند دنوں کے بعد ایک عطار کی دکان پر جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ آداب بجالانے کے بعد کرسی پیش کی اور کہنے لگے، "اُزبک صاحب ہمیں معلوم نہ تھا کہ آپ اتنے بڑے ادیب ہیں، ورنہ گستاخی کبھی نہ ہوتی۔"

"کون سی گستاخی قبلہ؟"

"پچھلے دنوں آپ شربتِ بنفشہ لینے آئے تھے اور ہم نے آپ سے پیسے لے لیے تھے۔"

"اس میں تو کوئی گستاخی نہیں۔ آخر پیسے تو آپ....."

"نہیں صاحب! یہ بہت بڑی گستاخی ہے۔ خیر اِس کی تلافی آج کر دی جائے گی۔ شربتِ بنفشہ ہی چاہیے نا آپ کو؟"

''جی ہاں! چار تولے دے دیجیے۔''

''تولوں کا حساب چھوڑیے اُزبک صاحب، آپ بوتل ہی لے لیجیے..... ارے بھئی خیراتی لال، اُزبک صاحب کو شربتِ بنفشہ درجہ خاص کی ایک بوتل لا دو۔''

''لیکن قبلہ مجھے بوتل نہیں چاہیے۔''

''اجی صاحب ہماری طرف سے ناچیز تحفہ سمجھ کر لے جایئے۔ واہ واہ کیا مضمون لکھا آپ نے۔''

بوتل پیش کرنے کے بعد انھوں نے بتایا کہ مِس چنبیلی کے غائبانہ مداح ہیں۔ ''فلم باز'' کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں اور صرف یہی ایک رسالہ ہے جسے ان کی دکان میں پُڑیا باندھنے کے کام میں نہیں لایا جاتا۔

اُن کا شکریہ ادا کر کے گھر پہنچا تو چند فلم زدہ لڑکیاں وارد ہوئیں۔ بے چاری بے حد پریشان تھیں اور میری رہنمائی چاہتی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ دریافت کرنے آئی تھی کہ اگر میں ایک کالی بلی مِس چنبیلی کو بھجوا دوں تو کیا وہ اسے قبول کر لے گی.....؟ دوسری کے پاس کھوٹے سکّوں کا ذخیرہ تھا، وہ اسے مِس چنبیلی کی نذر کرنا چاہتی تھی..... تیسری یہ جاننے کی خواہش مند تھی کہ مِس چنبیلی کون سا دیسی صابن استعمال کرتی ہے؟ ان سب کو مناسب مشورے دیے گئے اور وہ خوش و خرم رخصت ہوئیں۔

اُسی دن ایک مشہور ادبی رسالے کے ایڈیٹر صاحب کا خط ملا کہ وہ فانی بدیوانی پر ایک نمبر نکال رہے ہیں، اس لیے ہم انہیں ایک مضمون بعنوان ''فانی کی شاعری پر شوپن ہار کا اثر'' لکھ کر بہ واپسی ڈاک بھجوائیں۔ ہم نے انھیں جواب میں جو خط لکھا وہ سننے کے قابل ہے:

''محترمی..... غالباً آپ کو معلوم نہیں کہ میں ادبی مضامین سے مدت سے تائب ہو چکا ہوں۔ میرے خیال میں یہ سراسر تضیعِ اوقات ہے، نیز مالی لحاظ سے سخت خسارے کا سودا ہے۔ اگر میں آپ کے رسالے کے لیے مضمون لکھوں گا تو زیادہ سے زیادہ آپ یہ کریں گے کہ مجھے رسالہ بھجوا دیں گے، یا یہ سمجھتے ہوئے کہ اگر مجھے اپنا مضمون پڑھنے کا شوق ہوا تو میں خود ہی خرید لوں گا، رسالہ بھی نہیں بھجوائیں گے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں صرف فلمی مضامین لکھا کروں گا۔ پچاس روپے معاوضہ ملتا ہے، کھانے کو پان اور پینے کو شربتِ بنفشہ مفت مل جاتا ہے۔ نیز ہمسائے سمجھتے ہیں کہ ہم واقعی بہت بڑے ادیب ہیں۔ صاف گوئی کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں تو میری طرف سے اپنے رسالے میں یہ اعلان شائع فرما دیں کہ آئندہ کوئی ادبی رسالہ مجھ سے ادبی مضمون کا تقاضا نہیں کرے۔ فقط

☆☆☆

شادی گرافی

سید نصرت

کیا آپ کی ''شادی گرافی'' ہو چکی ہے؟ ہمارا مطلب ہے ''شادی ہو چکی ہے؟'' اگر آپ کا جواب ہاں میں ہے اور آپ اپنی شادی کی جملہ تقاریب کا ایک مؤثر ویڈیو کیسٹ بھی رکھتے ہوں تو اس سے مراد ایک ایسی دستاویز ہے، جسے آپ جب چاہیں دیکھ کر اپنی بے شمار حسین حماقتوں کو یاد کر سکتے ہیں اور حسب توفیق ہنس یا رو سکتے ہیں! فی زمانہ شادیوں کی تقاریب میں لڑکی کے ایجاب و قبول، قاضی کے خطبۂ نکاح اور وکیل و گواہوں کی موجودگی کے بعد جو سب سے اہم اور لازمی چیز ہوتی ہے وہ ایک ویڈیو گرافر ہے۔ (لڑکے کی مرضی اور منشا کا نمبر قدرے بعد میں آتا ہے!)

اگلے وقتوں میں شادی کے موقع پر دلہا، دلہن کو صرف فوٹو گرافی پر قناعت کرنی پڑتی تھی، جس کے لیے ایک مشکوک قسم کے فوٹو گرافر کو زحمت تصویر کشی دی جاتی تھی جو دلہا سے زیادہ دلہن اور زنان خانے میں دلچسپی لیتا۔ وہ جب دلہن کی تصویریں مختلف زاویوں سے اتار لیتا اور خواتین میں گھوم پھر کر ذوق بینائی کی پوری طرح تسکین حاصل کر لیتا، تب کہیں ''حجرۂ کرخت'' یعنی مردانے کا رُخ کرتا اور ازراہِ مروت دلہا میاں کی چند قابل رحم انداز کی تصویریں اتار لیتا تھا جس میں چند تصویریں تو سہرے کے ساتھ ہوتیں (جن سے اس بات کا بالکل پتا نہ چل پاتا کہ سہرے کے پیچھے کیا ہے!) اور چند تصویریں ایسی ہوتیں جس میں دلہا کے چہرے پر مسکراہٹ تو نظر آتی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُس کی آنکھوں میں اس بچے کی طرح خوف و ہراس کی پرچھائیں بھی صاف نظر آتیں جو کوئی بڑی شرارت کر کے سزا کے خوف سے لرزاں رہتا ہے!

کچھ دنوں بعد فوٹو گرافر صاحب اپنے فن کی مہارت اور دلہا اور دلہن کی باہمی محبت کو اجاگر کرنے کے لیے پورے البم کے ساتھ دلہا کو ایک بڑے سائز کی تصویر نذر کرتے جس میں دلہا کے سہرے یا پگڑی وغیرہ میں دلہن کے چہرے کو اجاگر کیا جاتا تھا، پھر یہ البم کچھ دنوں تک تو بڑے شوق و ذوق سے دیکھا جاتا اور دلہا، دلہن اپنی حماقتوں کو یاد کر کے حسب توفیق یا تو خوش ہو لیا کرتے یا پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتے۔ اس کے بعد یہ البم طاق کی زینت بن جاتا اور زمانے کے سرد و گرم سہہ سہہ کر اس کے رنگ، دلہا دلہن کے چہروں کے رنگوں کی طرح پھیکے پڑنے لگتے اور تصویریں دھندلانے لگتیں..... مگر جب سے ویڈیو گرافی کا چلن عام ہوا ہے، شادی کے خوشگوار سانحے کو مدتوں محفوظ رکھنے کا ایک اچھا ذریعہ ہاتھ آ گیا ہے۔

ویڈیو گرافر چاہے دلہن والوں کی طرف سے ہو یا دلہا والوں کی طرف سے، اس کی اہمیت اور حیثیت قریبی رشتہ داروں سے کہیں زیادہ ہوا کرتی ہے۔ دلہن کے مایوں بٹھانے اور دلہا کی رسم مہندی سے لے کر ولیمہ، اور شادی کے ''مابعد اثرات'' تک اس کی مانگ رہتی ہے۔

شادی کی ویڈیو فلم کسی عام فیچر فلم کی طرح ہی ہوتی ہے۔ تین گھنٹے طویل اور باکس آفس کے تمام مسالوں سے لیس۔ اس میں ہیرو اور ہیروئن کی جگہ دلہا اور دلہن ''اداکاری'' کرتے ہیں۔ فلم میں ہیرو اور ہیروئن کے ماں باپ اور بھائی بہنوں کا کردار موزوں اداکار ادا کرتے ہیں، لیکن ویڈیو فلم میں تمام کردار اصلی ہوتے ہیں، یعنی دلہن کے باپ کا کردار دلہن کا باپ ہی ادا کرتا ہے اور دلہا کی والدہ کردار دلہا کی والدہ ہی ادا کرتی ہیں

وغیرہ وغیرہ۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ فیچر فلم میں ہیروئن کا باپ' ہیرو کو اپنی بیٹی سے شادی کرنے سے باز رکھنے کے لیے اسے ڈرانے دھمکانے، ولن کے ذریعہ پٹوانے سے لے کر روپیوں پیسوں کا لالچ دینے تک' سارے آزمودہ ہتھکنڈے آزماتا ہے مگر شادی گرافی میں دلہن کا باپ انتہائی فراخ دلی اور خندہ پیشانی سے اپنی بیٹی کا ہاتھ دلہا کے ہاتھ میں دے کر تمام فکروں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ویسے کبھی کبھی شادی کے موقع پر بھی ولن، دلہا کے باپ، چچا یا خالو وغیرہ کی صورت میں نمودار ہو جاتا ہے جو چیخ کر کہتا ہے: ''ٹھہرو! یہ شادی نہیں ہو سکتی!'' لیکن ان نازک لمحات کی ویڈیو بنانے کا رواج نہیں ہے!

نکاح کے وقت دلہا اور قاضی دونوں کی توجہ ایک دوسرے کی طرف کم اور کیمرے کی طرف زیادہ ہوتی ہے۔ دونوں خوب سے خوب تر پوز دینے اور اچھی اداکاری کی دُھن میں مبتلا ہوتے ہیں۔ قاضی صاحب کو موقع مل جائے تو وہ فوراً کھڑے ہو کر شادی اور اس کی افادیت پر ایک طویل لیکچر دینے سے بھی نہیں چوکتے۔ مقصد غالباً یہ ہوتا ہے کہ وہ کیمرے میں شاندار نظر آئیں۔ نکاح کے بعد مہمانوں کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ دلہا کو گلے لگا کر مبارکباد (اور تسلی و حوصلہ) دیں! اس تمام کارروائی کو بھی عکس بند کیا جاتا ہے۔ اس افراتفری میں بعض اوقات اس بات کا بھی پتا نہیں چلتا کہ کون کس سے گلے مل رہا ہے! کچھ لوگ ویڈیو کیمرے کی زد سے باہر ہوتے ہیں تو کچھ وہ ہوتے ہیں جنہیں ویڈیو میں اپنے آپ کو دیکھنے کا شوق اور اپنے آپ کو فلمی ہیرو سمجھنے کا خبط ہوتا ہے۔ وہ گھات لگا کر عین اس وقت دلہا کو مبارکباد دیتے ہیں جبکہ دلہا کیمرے کی زد میں ہوتا ہے اور وہ دلہا کو اس وقت تک اپنی بانہوں میں دبائے رکھتے ہیں جب تک کہ کیمرے کا رُخ کسی اور طرف نہیں ہو جاتا۔

مبارکباد کے طویل سلسلے کے بعد گروپ تصویروں کی باری آتی ہے اور دلہا کے ساتھ مختلف لوگ گروپ بنا کر یوں ویڈیو بنواتے ہیں' جس طرح کسی ساکت کیمرے سے تصویر اتاری جاتی ہے۔ ویڈیو گرافر دیر تک ایک ایک گروپ اور گروپ کے ایک ایک فرد کی طرف کیمرے کا رُخ کر کے عکس بندی کرتا ہے۔ ایسے مواقع پر اکثر حضرات اپنی پلکیں جھپکانا بھی بھول جاتے ہیں' کہ کہیں تصویر بگڑ نہ جائے!

ویڈیو گرافر کی حیثیت موقع واردات کے کسی چشم دید گواہ سے بھی زیادہ معتبر اور مستند ہوتی ہے! جتنے بھی لوگ (دعوتی اور بن بلائے مہمان) کھانے کی دعوت میں شریک ہوتے ہیں' وہ ان کی مختلف انداز اور پوزیشن میں ویڈیو گرافی کر لیتا ہے' جس کی مدد سے بعد میں میزبان کو اس بات کا بخوبی پتا چل سکتا ہے کہ کس نے کتنا کھایا' کتنے مرغوں سے زور زبردستی کی گئی' ہر لیس کی پلیٹ نے کس کس کو حریص بنایا اور شکر کی بیماری کے کتنے مریضوں نے میٹھے کی پلیٹوں سے اپنی وفا نبھائی!

کچھ لوگ ویڈیو گرافر کی نظروں سے بچنے کی خاطر کھانے کے دوران انتہائی نفاست اور پاکیزگی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور کھانا یوں کھاتے ہیں جیسے نواب واجد علی شاہ بقدرِ بادام ناشتہ کر رہے ہوں لیکن یہی حضرات جب ان کے پڑوس والی میز کی ویڈیو گرافی کے دوران پس منظر میں دکھائی دیتے ہیں تو ان کی تمام تر جولانیوں کو پوری آب و تاب کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ بالکل اس شیر کی مانند دکھائی دیتے ہیں جو اپنے تازہ شکار پر ہاتھ صاف کر رہا ہوتا ہے۔ کھانے کی دعوت کا ابتدائی منظر بھی دیکھنے لائق ہوتا ہے۔ جب ساری میزوں پر کھانا سجا دیا جاتا ہے اور میزبانوں کے ٹولے سے کوئی صاحب یہ آواز لگاتے ہیں کہ ''آیئے حضرات'' تو یوں دکھائی دیتا ہے جیسے کہیں ماراتھن کی ریس میں سیٹی بجنے پر دوڑ میں شامل

حضرات اوّل نمبر آنے کی کوشش میں دوسروں کو دھکا مار کر آگے نکل رہے ہوں۔ اب جو معصوم اور مسکین قسم کے لوگ ہوتے ہیں، وہ اس دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور انہیں ایک طویل انتظار کی صعوبت سے گزرنا پڑتا ہے۔ بالآخران کے حصے میں زخمی قسم کا کھانا اور بیروں کی سرد مہری ہی آتی ہے!

دلہا، اس کے قریبی عزیز و اقارب اور دوستوں کے لیے بطور خاص ایک بے تکلف قسم کے دسترخوان کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس کی ویڈیو گرافی ذرا طویل ہوتی ہے۔ دلہا کے ہاتھ دھونے کے منظر سے لے کر دانتوں میں خلال کرنے تک کے سارے منظر کو، ویڈیو گرافر خاصی مہارت سے عکس بند کرتا ہے۔ بعد میں اس منظر کو دیکھ دیکھ کر دلہا اپنی آزاد نہ زندگی کے آخری دن اور آخری بے تکلف قسم کے کھانے کو یاد کر کے آہ بھر لیا کرتا ہے۔ دلہا کے دوستوں اور سسرالی رشتہ داروں کی اس موقع پر لاجواب اداکاری دیدنی ہوتی ہے، وہ ہر منٹ دو منٹ بعد دلہا کی پلیٹ میں کچھ نہ کچھ انڈیلتے رہتے ہیں اور دلہا کی خاطر مدارات کرتے ہوئے ان کی نظر ویڈیو گرافر کے کیمرے کی طرف کچھ اس ادا سے اُٹھتی ہے جیسے وہ کسی حسینہ کو دیکھ رہے ہوں! کیمرے کا رُخ میز پر چنے گئے تمام لوازمات کی تفصیلی ویڈیو گرافی کرتے ہوئے دلہا کی پلیٹ پر مرکوز ہو جاتا ہے، جس میں بیک وقت مرغ کے گاہے گاہے چچوڑے ہوئے پارچے، تباہ حال بریانی کی باقیات اور میٹھے میں مدغم ہوتی ہوئی دہی کی چٹنی آسانی سے پہچانی جا سکتی ہے۔

شعبۂ خواتین میں کھانے کا منظر البتہ ذرا مختلف ہوتا ہے۔ یہاں ویڈیو گرافر پہلے تو خواتین کے رنگا رنگ ملبوسات اور زیورات کی تفصیلی عکس بندی کرتا ہے، پھر کچھ قدرے حسین چہروں کو ایک کے بعد دیگرے مختلف پوز میں اپنے کیمرے میں قید کر لیتا ہے، جنہیں بعد میں وہ کلوز اَپ کی شکل میں پوری کیسٹ میں یہاں وہاں کلپ کے ذریعہ اجاگر کرتا رہتا ہے۔ خواتین کے کھانے کے آداب و اطوار خاصے دلچسپ ہوا کرتے ہیں اور وہ پوری نفاست اور شائستگی کے ساتھ کھانے کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ اپنے رنگین اور دلکش پیرہن کی سلوٹوں کو بار بار درست کرتے ہوئے ایک ادا سے شریر زلفوں کی لٹوں کی پیشانی سے ہٹایا جاتا ہے اور زیورات کی پوزیشن کو برابر کیا جاتا ہے اور اس دوران وہ کن انکھیوں سے کیمرے کی طرف ایک ادائے دلبری کے ساتھ دیکھنا نہیں بھولتیں۔ اب ویڈیو گرافر ایک ایک خاتون کی تفصیلی عکس بندی کرنے کے بعد دلہن کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ دلہن کے چہرے پر امڈتے ہوئے سارے احساسات، آنے والے خوشگوار لمحوں کے تصور سے گلنار ہوتے ہوئے رخسار، اپنوں کی جدائی سے خائف اس کی جبیں پر نمودار ہونے والے پسینے کے ننھے ننھے قطرے اور آنکھوں میں انجانی مسرت، انجانے خوف اور ایک درخشاں زندگی کی آس میں نمودار ہوتے ہوئے لرزاں سائے، دلہا سے بہت پہلے ہی ویڈیو گرافر نہ صرف دیکھ لیتا ہے بلکہ اپنے کیمرے میں قید بھی کر لیتا ہے۔

دلہن کے کھانے کا منظر بھی خاصا دلچسپ ہوتا ہے۔ اُسے بھی اس کی سہلیاں اور قریبی رشتہ دار لڑکیاں اپنے گھیرے میں لیے اپنے اپنے انداز میں کھانا کھلاتی ہیں۔ اگر دلہن نئے زمانے کی ہوئی تو ویڈیو گرافر کو کوئی دقت نہیں ہوتی اور وہ پورے اطمینان سے دلہن کے شرما شرما کر کھانے کے اطوار کو عکس بند کر لیتا ہے، لیکن اگر دلہن اگلے وقتوں کی ہوئی اور ایک لمبا سا گھونگھٹ اوڑھے اپنی سہیلوں کے رحم و کرم پر ہو تو پھر اس بات کا بالکل ہی پتا نہیں چلتا کہ سہیلوں کے ہاتھوں اس کے گھونگھٹ کے اندر جانے والا لقمہ اس کے منہ تک گیا بھی ہے یا راستے ہی میں کہیں دَم توڑ گیا ہے۔

ویڈیو فلم کے پس منظر میں گانوں کے جو بول اُبھرتے ہیں وہ ویڈیو گرافر کی اپنی پسند، ذوق اور فہم کے مطابق ہوتے ہیں۔ ویڈیو گرافر کو

اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ اس کی اپنی پسند کے گانوں کو کوئی دوسرا پسند کرے گا یا نہیں' وہ تو اپنی ذہانت اور سوجھ بوجھ کے مطابق ان گانوں کا انتخاب کرتا ہے' مثلاً ایک ویڈیو کیسٹ میں ہم نے دیکھا کہ جب دلہا میاں' رونمائی کی رسم پوری کر کے زنان خانے سے باہر آ رہے تھے تو پس منظر میں یہ گانا بج رہا تھا کہ ''کر چلے ہم فدا جان و تن ساتھیو.....اب تمہارے حوالے.....!'' اسی طرح ایک اور ویڈیو کیسٹ میں جب دلہا کو مبارکباد دینے والوں کی عکس بندی کی جا رہی تھی تو پس منظر میں یہ گانا گونج رہا تھا ''میرا یار بنا ہے دلہا اور پھول کھلے ہیں دل کے'' اور جب گانے کے یہ بول بجے کہ ''ارے میری بھی شادی ہو جائے' دعا کرو سب مل کے'' تو کیمرے کا رخ مہمانوں کی قطار میں بیٹھے ہوئے چند ایسے بزرگوں کی طرف کیا گیا جو حقیقتاً قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔!!

دلہن کی رخصتی کے وقت ہر ویڈیو گرافر پس منظر میں وہ شہرۂ آفاق گانا بجانا نہیں بھولتے' جس کے بول ہیں: ''بابل کی دعائیں لیتی جا..... جا تجھ کو سکھی سنسار ملے'' لیکن ایک ویڈیو گرافر نے کچھ ندرت کی خاطر ایک ویڈیو گیت میں اسی موقع پر یہ گانا شامل کر دیا' جس کے بول تھے: ''اے میرے مشکل کشا فریاد ہے فریاد ہے.....آپ کے ہوتے ہوئے دنیا میری برباد ہے برباد ہے۔!!''

ہمارے ایک کرم فرما نے خاصی عمر میں شادی رچانے کا پروگرام بنایا اور حسب معمول ان کی شادی کی بھی ویڈیو گرافی کی گئی۔ مختلف مناظر کی ویڈیو گرافی کے بعد جب کیمرہ، دلہن پر فوکس کیا گیا تو پس منظر میں یہ گانا گونج اُٹھا: ''میں کا کروں رام مجھے بڈھا مل گیا!'' اس کے بعد ویڈیو گرافر کی نہ صرف جم کر پٹائی کی گئی بلکہ اسے اُس کی اجرت سے بھی محروم کر دیا گیا۔!

دلہن کی وداعی تقریب کا منظر بھی خاصا رقت انگیز ہوتا ہے۔ اس موقع پر دلہن کے ماں باپ انتہائی رنجیدہ خاطر ہوتے ہیں اور اس مرحلے میں ویڈیو گرافر بڑی محویت کے عالم میں ویڈیو گرافی کیا کرتے ہیں۔ ہم ایک ویڈیو گرافر سے واقف ہیں جو ایک وداعی منظر کی ویڈیو گرافی کرتے کرتے اتنے کھو گئے کہ انہیں پتا ہی نہ چلا کہ ویڈیو فلم کیمرے میں رکی پڑی ہے۔ پھر عین دلہن کے کار میں بیٹھنے کے وقت انہیں اس خرابی کا علم ہوا' انہوں نے دلہن کے ماں باپ سے عاجزانہ گزارش کی کہ وداعی کے منظر کو پھر دہرائیں اور دلہن کو واپس میرج ہال میں لے جا کر پھر سے بادیدۂ نم رخصت کریں تا کہ ویڈیو کا کلائمکس عمدگی سے فلمایا جا سکے۔ چنانچہ مجبوراً دلہا کو کار سے اترنے کا حکم دیا گیا' دلہن کو اس کے بھائیوں نے تھام کر واپس شادی ہال کا رُخ کیا۔ باجے والوں نے پھر سے نئی دُھن چھیڑی، دلہن کے ماں باپ اپنے بچے کھچے آنسو بہاتے ہوئے' دلہن کے ساتھ تھکے تھکے انداز میں کار کی طرف پھر سے بڑھے اور حیران و پریشان دلہن کو دوسری بار رخصت کیا۔ ویڈیو جب مکمل ہو کر آئی تو منظر اور اس کے پس منظر میں بجنے والا یہ گیت خاصا مضحکہ خیز لگا:

ع اوجانے والے ہو سکے تو لوٹ کے آ۔!!

☆☆☆

گشتی عقوبت خانہ

ڈاکٹر محمد محسن

یہ جو تین ٹانگوں پر کھڑا ہے۔ جانتے ہیں کیا ہے؟ یہ ایک گشتی عقوبت خانہ ہے۔ آپ کا جانا پہچانا ہے۔ لائسنس یافتہ ہے۔ عرف عام میں 'رکشا' کہلاتا ہے۔ جو اس پر سوار ہونے کی غلطی کرتا ہے اس کا ایمان تازہ ہو جاتا ہے' زبان پر کلمہ شہادت جاری ہو جاتا ہے' تمام راستے ساتھ خیریت کے منزل مقصود تک پہنچنے کی دعا مانگتا جاتا ہے!

اقبال جرم کے لیے ملزم کو زنجیر سے جکڑ کر اس پر سوار کرا دیں اور کسی خستہ حال سڑک پر دو چار پھیرے لگوا دیں' پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ ملزم کے سارے کس بل نکل جائیں گے' چوکڑی بھول جائے گا۔ کیسا ہی سخت جان ہو' اقبال جرم کر لے گا۔ رکشے میں بیٹھنے سے پہلے اگر ملزم ہو گا تو رکشے میں چند منٹ سفر کرتے ہی خود کو مجرم محسوس کرنے لگے گا۔

جب یہ عجوبہ' دو تیز رفتار بسوں کے درمیان میں کسی تنگنائے سے گزرتا ہے تو مسافروں کی گھگی بندھ جاتی ہے' آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے' موت سر پر رقصاں نظر آتی ہے۔ موت کو اتنے قریب دیکھ کر سارے صغیرہ و کبیرہ گناہ یاد آ جاتے ہیں۔ ابھی انسان اپنے گناہوں سے تائب ہونے کی سوچ ہی رہا ہوتا ہے کہ تین پہیوں والا یہ بازی گر، اس تنگنائے سے خوبصورتی سے گزر جاتا ہے' اس طرح کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ موت کے ٹل جانے پر گناہوں سے توبہ کا پروگرام بھی غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی ہو جاتا ہے۔

زمانہ کبھی کبھی قیامت کی چال چلتا ہو گا۔ یہ تو روزانہ قیامت کی چال چلتا ہے۔ سڑک پر لہراتا بل کھاتا چلا جاتا ہے۔ کبھی کسی تیز رفتار بس کے سامنے سے اچانک گزر جاتا ہے' کبھی کسی کار کے آگے پلک جھپکتے ہی آ جاتا ہے اور اس طرح کار ڈرائیور کی مہارت اور لائسنس کے اصلی ہونے کا امتحان لے لیتا ہے۔ !اس پر سوار ہوتے وقت موت کو نہیں بھولنا چاہیے۔ یہی بات یاد دلانے کے لیے اس کی پشت پر اکثر یہ تحریر جلی حروف میں لکھی ہوتی ہے:

''موت کو مت بھولو۔!''

کسی کا ہاضمہ خراب ہو' بھوک نہ لگتی ہو، قبض رہتا ہو، طبیعت گری گری رہتی ہو' نیند نہ آتی ہو، رکشے میں بیٹھ کر دو چار کلو میٹر پابندی سے ''چہل قدمی'' کر لیا کریں، ساری شکایات جاتی رہیں گی۔ سوئی ہوئی آنتیں جاگ اُٹھیں گی' آنتوں کے سارے کس بل نکل جائیں گے' بھوک چمک اُٹھے گی' قبض ٹوٹ جائے گا، آنکھیں کھل جائیں گی، دورانِ خون تیز ہو جائے گا، ریڑھ کی ہڈی میں قوتِ برداشت پیدا ہو جائے گی، جوڑ کھل جائیں گے، فرحت و تازگی کا احساس جاگ اُٹھے گا۔ گھڑ سواری سے کہیں بہتر سواری ہے۔ اس پر سواری کرنے والوں کی صحت قابل رشک ہوتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ قابل رشک صحت والے ہی اس پر سواری کر سکتے ہیں۔

ایسے بوڑھے جن کے جسم میں کیلشیم کی کمی ہو، جن کی ہڈیاں کمزور ہوں، جوڑوں میں درد رہتا ہو، ریڑھ کی ہڈی میں شکست و ریخت کا عمل شروع ہو چکا ہو ان کے لیے اس گشتی عقوبت خانے کی سواری بڑی مہنگی پڑتی ہے۔ سارے جوڑ ہل کر رہ جاتے ہیں' اعصابی درد شروع ہو جاتا ہے' اگر ہڈیاں کچھ زیادہ ہی خستہ حال ہوں تو کولہے کی ہڈی بھی ٹوٹ سکتی ہے' عمر بھر کے لیے معذور بھی ہو سکتے ہیں۔

کمزور دل کے مریضوں کو اس پر سوار ہونے سے گریز کرنا چاہیے۔ خوف سے بلڈ پریشر بڑھ سکتا ہے' دماغ کی رگ پھٹ سکتی ہے' انجائنا کے مریض کو ہارٹ اٹیک بھی ہو سکتا ہے۔ اگر سینے میں درد شروع ہو جائے تو دل تھام کر بیٹھنا پڑ جاتا ہے' کیا پتا باری آ گئی ہو۔

عرق النساء کا مریض تو اس میں بیٹھ ہی نہیں سکتا۔ بیٹھ جائے تو درد کی شدت سے چیخیں نکل جاتی ہیں۔ مہینوں بستر سے اُٹھنے کے قابل نہیں رہتا۔ اگر اُٹھنے بیٹھنے کے قابل رہ جائے تو اُٹھتے بیٹھتے اس سواری کو برا بھلا کہتا رہتا ہے۔ کسی سے دشمنی ہو، انتقام لینا چاہیں تو اسے دوست بنا لیں اور رکشے میں بٹھا کر کراچی کی سیر کرا دیں۔ دشمنی کا حق ادا ہو جائے گا۔

ہم نے مانا کہ اس عجوبے کا شمار ذرائع نقل و حمل میں ہوتا ہے' لیکن جو خواتین امید سے ہوں' اس پر ہرگز ہرگز سوار نہ ہوں۔ کبھی کبھی اس کی سواری امیدوں پر پانی پھیر دیتی ہے۔ تجربے کی بات تھی' بتا دی' آگے آپ کی مرضی۔

اس کی آواز میں جادو ہے۔ کوئی شامت اعمال کا مارا اس کے پاس کھڑا ہو اور اس کا انجن بیدار ہو تو اس کی آواز سے سماعت پر جادو سا ہو جاتا ہے۔ چند لمحوں کے لیے قوتِ سماعت جواب دے جاتی ہے' کان بند ہو جاتے ہیں' کچھ سنائی نہیں دیتا۔ تھوتھا چنا باجے گھنا، والی ضرب المثل اسی پر صادق آتی ہے۔ بڑی بڑی بسیں اتنا شور نہیں مچاتیں، جتنا یہ اکیلا مچا لیتا ہے۔

اس پر سواری کرنے کے کچھ آداب ہیں۔ اگر ان پر عمل نہ کیا جائے' جم کر نہ بیٹھا جائے' احتیاطی تدابیر اختیار نہ کی جائیں تو چھت پر لگے ہوئے لوہے کے ڈنڈے سے سر ٹکراتا ہے۔ اسپیڈ بریکر پر تو اس زور سے ٹکراتا ہے کہ دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں۔ بڑی دیر تک سر سہلانا پڑتا ہے۔ ہمارا تو یہ حال ہو گیا ہے کہ سر میں جگہ جگہ گومڑے پڑے ہوئے ہیں۔ رکشے سے خوف آتا ہے' پاس سے کوئی رکشا گزر جاتا ہے تو سر یاد آتا ہے۔

دل کے بعض امراض میں دل کی دھڑکن سست ہو جاتی ہے' ماہرین امراض قلب ''پیس میکر'' لگوانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ ایسے مریض' پیس میکر کی جگہ رکشا لگوا لیں! اسی میں آیا جایا کریں' دل کی دھڑکن خود بخود تیز ہو جائے گی' علاج کی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی۔

رکشے میں بیٹھ کر اخلاقی قدریں بدل جاتی ہیں۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' جبھی تو کہہ رہے ہیں۔ ایسے ایسے نیک اور فرماں بردار بچے' جو والدین سے کبھی اونچی آواز میں نہیں بولتے' اس میں بیٹھ کر اس قدر چیخ چیخ کر بولتے ہیں کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ والدین کو ان کا اونچی آواز میں بولنا ناگوار بھی نہیں گزرتا۔

اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ذہنی اذیت کسے کہتے ہیں' مینٹل ٹارچر کیا چیز ہوتی ہے تو رکشے میں بیٹھتے ہی میٹر آن کروا دیں۔ کرائے

کے لیے سودے بازی نہ کریں، منزل مقصود پر پہنچ کر جب میٹر پر نظر پڑے گی تو ہوش اُڑ جائیں گے۔ دماغ چکرا کر رہ جائے گا۔ میٹر، ہیٹر کا کام کرتا ہے! خون کھولنے لگتا ہے، تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے، ایسی شدید ذہنی اذیت ہوتی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

اس کی چیرہ دستیاں ایک طرف، بچوں کی دلچسپیاں ایک طرف۔ بچے اس پر سوار ہو کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ انہیں رولر کوسٹر کا مزا آتا ہے۔ ان کا بس چلے تو سارا دن اس میں گھومتے پھریں، اترنے کا نام نہ لیں۔ بچے مہم جو طبیعت کے مالک ہوتے ہیں۔ اس میں سوار ہونے کو کھیل سمجھتے ہیں۔ بچے پھر بچے ہیں انہیں جان جوکھوں میں ڈال کر ہی مزہ آتا ہے۔ ان سے ہمارا کیا مقابلہ! ہم تو جان بچانے کے چکر میں لگے رہتے ہیں۔ جان ہے تو جہان ہے۔

☆☆☆

ایم اے راحت کے جادوئی قلم سے خوف و اسرار میں لپٹا ہوا دہشتناک ناول

مکمل اور ضخیم ناول

بچھو

ایک ایسے قبیلے کی داستان جو انسانی خون اور گوشت کا نذرانہ لیتا تھا
خون پی کر کالی شکتی حاصل کرنے والا شخص کون تھا؟
بچھو کے دھڑ پر انسانی چہرہ کس کا تھا؟

قیمت 300/- روپے

یتّی

اس طویل و عریض دنیا میں ابھی بے شمار حقائق ایسے بھی ہیں جن سے انسان پوری طرح باخبر نہیں ہو سکا ہے لیکن اس کی تجسس پسند فطرت ہر روز کسی نئے چونکا دینے والے انکشاف کے لئے اسے بے قرار رکھتی ہے۔ ایسے ہی چند تحقیق کے میدان کے کھلاڑیوں کی مہم جوئی کا قصہ۔ وہ ایک ان دیکھی مخلوق کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین تھے۔ ان کی مہم جو طبیعت انہیں خطرناک راستوں پر لے آئی تھی۔ ایک یتّی (برفانی انسان) کی انہیں تلاش تھی۔ اس کتاب کا قصہ جس کا آخری باب تحریر کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ انگریزی ادب سے یہ انتخاب، کتاب گھر کے ایکشن ایڈونچر ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

کلامِ صنفِ نازک بے اثر!

نیر اعجاز

سنتے آئے تھے کہ تندرستی ہزار نعمت ہے، بزرگ کہا کرتے تھے..... جان ہے تو جہان ہے' لیکن فی زمانہ یہ جملے اپنی قدر و قیمت کھو چکے ہیں اب تو یوں کہا جاتا ہے کہ تندرستی ہزار زحمت ہے، جان ہے تو جنجال ہے! آج کل ہماری نوجوان نسل پر صرف اور صرف نازک اندام اور سبک ہونے کا بھوت سوار ہے' اور اس بھوت کا سب سے زیادہ فائدہ کاروباری حضرات کو پہنچ رہا ہے۔ ہر طرف سلیمنگ سینٹر اور فٹنس کلب کھولے جا چکے ہیں اور خواتین اپنے معصوم شوہروں اور ستم رسیدہ والدین کی محنت کی کمائی' خود اپنی جان کو داؤ پر لگا کر لٹا رہی ہیں۔ خواتین کی کسی بھی محفل میں چلے جایئے۔ بس یہی جملے سننے کو ملیں گے۔

''ارے کتنی اسمارٹ لگ رہی ہو!''

'ہنی سچ سچ بتاؤ نا کون سا سینٹر جوائن کیا ہے' یار پلیز؟''

اب بیچاری ہنی کتنا بھی یقین دلا دے کہ کوئی سینٹر جوائن نہیں کیا بلکہ میرا تو وزن پہلے سے بڑھ گیا ہے لیکن ان کے حیرت سے پھیلے منہ پر کوئی اثر نہیں پڑنے والا وہ تو ہنی سے سینٹر کا پتا معلوم کر کے ہی جان چھوڑیں گی۔

آواز آئی ہے۔ ''ارے ارے ہنی' ذرا ٹھہرو یہ تم ہو؟ بالکل نہیں پہچان سکی' یار، اتنی موٹی ہو گئی ہو' ڈائٹنگ کیوں نہیں کرتیں؟ ویسے ڈائٹنگ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا' میں نے تو سلیمر زکلب جوائن کر لیا ہے' فی الحال تو صرف دس ہزار دیے ہیں' باقی ایک ماہ بعد دینے ہیں' تم بھی جوائن کر لو' سچ بالکل اسمارٹ ہو جاؤ گی۔''

بیچاری ہنی کا چہرہ جو ابھی دو منٹ قبل تعریفی جملے سن کر کھل اُٹھا تھا پھر سے مرجھا جاتا ہے۔

لفظ ڈائٹنگ اور سلیمر زکلب ہمارے ملک میں فیشن کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ یوں تو ہماری قوم کو اپنے مشاہیر کو چھوڑ کر مغرب کے نقشِ قدم پر چلنے کی عادت ہے' لیکن اس بار مرکز بدل گیا ہے اور ہماری موجودہ نسل آج کل بالی وڈ کی حشر سامانیوں کا شکار بلکہ ''معمول'' ہے۔ پڑوسی ملک سے ہوا آئی ہے جس کے باعث ہر لڑکی کو سبک اور نازک اندام ہونے کا مرض ہو گیا ہے' ہر خاتون فیگر فوبیا کا شکار ہو گئی ہے اور اب یہ بیماری خواص سے نکل کر عوام تک آ پہنچی ہے اور آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ اس طبقے کو کسی بھی چیز کے ''پر'' لگا دینے میں ملکہ حاصل ہے۔ خواتین فیگر اور کاروباری حضرات بے وقوف بنانے میں مصروف ہیں۔ اب آپ کو ہر گلی کوچے میں اسکول کے علاوہ اگر کچھ نظر آئے گا تو ہو ہو گا بیوٹی پارلر یا فٹنس کلب۔

ایک شادی میں جانے کا اتفاق ہوا حسبِ عادت دیر سے پہنچے' لہٰذا ایک کونے میں بیٹھ گئے' ذرا سانس لے کر شناسا چہروں کی تلاش شروع

کی' ایک جانب ہمیں لڑکیوں اور خواتین کا مجمع نظر آیا ہم سمجھ گئے کہ دلہن صاحب یہیں رکھی ہوئی ہوں گی۔ رکھی ہوئی کے الفاظ ہم نے اس لیے استعمال کیے کہ دلہن ہمارے خیال میں کوئی جاندار چیز نہیں ہوتی، گردن جتنی جھکا دی، جھک گئی، ہاتھ جس طرح رکھ دیا، بس رکھ دیا، کوئی چوں چرا نہیں..... مگر جیسے ہی ہماری نظر اسٹیج کی طرف گئی' ہم کیا دیکھتے ہیں کہ دلہن بالکل تنہا بیٹھی ہوئی ہے۔ ہمیں بڑی حیرت ہوئی مارے تجسس کے ہمیں اس ہجوم رنگ و بو کی طرف جانا پڑا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک محترمہ نوک پلک سے لیس بڑے رعب و انداز کے ساتھ کرسی پر براجمان ہیں اور خواتین ہاتھ باندھے بڑی مؤدبانہ انداز میں اس طرح کھڑی ہیں جیسے کسی پیر صاحب کے سامنے ان کے مرید کھڑے ہوتے ہیں۔ ان خاتون کے ہونٹوں کے ساتھ ان کے ہاتھ ایک خاص انداز میں چل رہے تھے' کبھی اپنی کٹی ہوئی زلفوں میں انگلیاں پھیرتیں، پھر اچانک اپنی بڑی بڑی غلافی آنکھیں خلاؤں میں گاڑ دیتیں، اور پھر سر جھٹک کر چہرے پر گہری سنجیدگی لیے گفتگو کرتیں آواز تو ہمیں آنہیں رہی تھی' صرف ''تصویر'' سے ہم نے اندازہ لگایا کہ یقیناً کوئی بڑی مصنفہ، شاعرہ یا پھر سماجی رہنما ہیں۔ اتنی سنجیدہ اور فکر میں ڈوبی ہوئی ایسی ہی کوئی شخصیت ہوسکتی ہے۔ ان کا میک اَپ اور بناؤ سنگھار دیکھ کر خیال آیا کہ ''بی بی'' کوئی سیاسی رہنما بھی ہوسکتی ہیں۔

ہم نے بھی ان کی گفتگو سننے کی کوشش شروع کردی اور اپنے کان پوری قوت کا سماعت کے ساتھ ان کی جانب لگا دیے۔ عقدہ یہ کھلا کہ محترمہ موٹاپے کے نقصانات بیان کررہی ہیں' ہم بھی پاگل ہیں بھلا اتنی ساری خواتین بغیر آواز نکالے کسی دوسری عورت کی بات سن سکتی ہیں؟ بہرحال ہم نے سوچا کہ جب آگئے ہیں تو پوری بات سن کر ہی جائیں گے انہوں نے پہلے تو کچھ ورزشیں بتائیں اس کے بعد یوگا کی مشقوں کا انسانی خدوخال پر ایسے ایسے اثرات واضح کیے کہ ہمارا دل چاہا کہ بس یہیں سے شروع ہوجائیں بڑی مشکل سے ہم نے خود پر قابو پایا۔ اس کے بعد وہ غذا کے چارٹ پر آگئیں۔ غذائی چارٹ بڑا افسوسناک تھا، صبح صرف ایک ابلا ہوا انڈا، ایک کپ فیشن ایبل یعنی بلیک چائے، دوپہر میں غم، سہ پہر میں قہر اور رات کے کھانے میں صبر و جبر کے ساتھ ایک کھیرا..... صرف کھیرے کا تصور کر کے ہی ہمارے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور ہمیں اس شخص پر بہت غصہ آیا جس نے سب سے پہلے لوگوں سے کھیرے کے فوائد بیان کیے ہوں گے۔ جب ہم نے دوسری خواتین کی طرف دیکھا تو محسوس کیا کہ خوراک کی اس کفایت شعاری بلکہ کنجوسی سے ہم ہی نہیں ان کے بھی ماتھے شکن آلود ہیں شامت اعمال ان محترمہ نے بھی اس ناگواری کو محسوس کرلیا بس پھر کیا تھا انہوں نے نہ صرف مرغن کھانوں کی بلکہ ہر طرح کے کھانوں کی ایسی برائیاں کیں اور ایسے خوفناک نقصانات اور خطرناک بیماریاں گنوائیں کہ ہم کھڑے کھڑے کانپنے لگے ایسا لگا کہ ہم چاروں طرف سے بیماریوں کی لپیٹ میں آگئے ہیں اور ہمارے اندر چربی کے بڑے بڑے پہاڑ قائم ہوچکے ہیں ہماری آنکھوں کے سامنے جاپانی پہلوانوں کے سراپے لہرانے لگے اور قبل اس کہ ہم بے ہوش ہوجاتے کھانا لگنے کا اعلان ہوگیا ہم نے دل میں تہیہ کرلیا کہ مرغن تو کیا آج سے کھانا ہی نہیں کھائیں گے۔ بس انہیں آہوں، سسرتوں، صبر اور جبر پر اکتفا کریں گے۔

ہم خود سے یہ عہد و پیمان کررہے تھے کہ ایک زبردست دھکے سے ہوش میں آئے تو دیکھا کہ وہی خاتون ساڑی ٹخنوں تک اُٹھائے راستے میں آئی ہر رکاوٹ کو روندتی ہوئی اس طرح آگے بڑھ رہی ہیں جس طرح کوئی سپاہی درختوں کو پچھاڑتا منزل کی طرف بڑھتا ہے دوسری خواتین بھی ان کی تقلید میں پیچھے چل دیں ہم بھی چل دیے ہماری نظریں مسلسل ان کا تعاقب کررہی تھیں دراصل ہم کچھ اور مفید معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔

یوں بھی کھانے کی نعمت سے تو ہم ہاتھ دھو چکے تھے۔ جب ہم نے دیکھا کہ وہ ایک جانب خاموش اکیلی کھڑی ہیں ہم ان کے قریب چلے گئے وہ ہمیں دیکھ کر مسکرائیں جواب میں ہم بھی مسکرانے ہی والے تھے کہ ایک دس بارہ سالہ بچی نہایت چڑھی ہوئی سانس کے ساتھ ان کے پاس آئی اس کے دونوں ہاتھوں میں پلیٹیں تھیں کہنے لگی:

''لیجیے پکڑیے امی بڑی مشکل سے لائی ہوں آپ ہمیشہ مجھے لانے کا کہہ دیتی ہیں اب دوبارہ خود لایئے گا میں نہیں لاؤں گی۔''

جب ہم نے ان کی پلیٹ کی طرف دیکھا تو ہماری آنکھیں نہ صرف پھیل گئیں بلکہ باہر نکل آئیں۔ پلیٹ تھی یا دیگ، سمجھ میں نہیں آرہا تھا لگتا تھا جیسے کوزے میں سمندر بند کر دیا گیا ہے۔ بریانی، قورمہ، چائنیز، اسنیکس اس طرح آپس میں بغل گیر تھے جیسے گولے گنڈے پر رنگ، کھانا کناروں سے باہر آرہا تھا۔ میٹھے کی پلیٹ کا بھی یہی حال تھا ہمیں تو جیسے سکتہ ہو گیا ان محترمہ نے جو ہماری حیرت زدہ شکل دیکھی تو بڑی جھینپی جھینپی مسکراہٹ سے کہا: ''بس کبھی کبھی'' اور بس پھر کیا تھا ہم بھی خالی پلیٹوں کی طرف دوڑے اور کھانے کے تھالوں پر لگے خواتین کے سمندر میں کود پڑے۔

☆☆☆

ایم اے راحت کے جادوئی قلم سے خوف و اسرار میں لپٹا ہوا دہشتناک ناول

معصوم چڑیل

قیمت 400 روپے

دو جلدوں میں مکمل

ٹائیں ٹائیں فش

کتاب گھر پر پیش کیا جانے والا، گل نوخیز اختر کا مقبول ترین ناول، جسے پاک و ہند کے قارئین نے سند قبولیت بخشی۔ اُردو کا پہلا مکمل مزاحیہ ناول، ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ اس ناول کو ایک بار شروع کر کے ختم کیے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ ٹائیں ٹائیں فش کہانی ہے ایک غریب گھر کے سادہ لوح نوجوان کی جسے حالات ایک ارب پتی لڑکی کا کرائے کا شوہر بنا دیتے ہیں۔ اس کاغذی شادی سے پہلے اور بعد میں کمال عرف کمالے کی سادہ لوحی اور حماقتیں کیا گل کھلاتی ہیں، جاننے کیلئے پڑھیے ٹائیں ٹائیں فش۔ اسے ناول سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ڈیڈی فیل ہو گئے!

عابد معز

میرا بلکہ ہمارا تین سالہ لڑکا ہر کسی سے سینہ پھلا کر تتلاتی زبان میں کہتا ہے: ''اسکول میں ہمارا امتحان تھا، میں اور ممی پاس ہوئے لیکن ڈیڈی فیل ہو گئے۔'' پھر وہ خوشی سے مجھ پر ہنسنے لگتا ہے 'ہا..... ہا.....'

اس نے یہی بات آج شام اپنے دادا چچا' یعنی میرے چچا سے کہی تو اُنہوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا: ''نتیجہ توقع کے مطابق ہے۔'' پھر انہوں نے لڑکے سے پوچھا: ''بیٹا..... ڈیڈی فیل کیسے ہوئے؟''

تین سالہ لڑکا بھلا اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ دادا چچا کو یوں دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو: ''جو فیل ہوئے انہی سے باز پرس کیجیے' میں تو پاس ہوا ہوں۔'' پھر وہ اپنی بندوق اُٹھائے کھیلنے چلا گیا۔

لڑکے کے جانے کے بعد چچا میری جانب یوں متوجہ ہوئے جیسے آج سے ٹھیک پچیس سال قبل میرے' تیسری جماعت میں انگریزی میں فیل ہونے پر مجھے غصہ سے دیکھا تھا: ''تم بتاؤ گے یا میں تمہاری دلہن سے پوچھوں؟''

''وہ بے چاری کیا بتائے گی۔ مجھ سے سنیے' میں آپ کو تفصیل بتاتا ہوں۔''

میں نے چچا سے کہا اور فیل ہونے کی روداد سنانے لگا: ''نیا تعلیمی سال شروع ہوا تو علم کے زیور سے آراستہ کرنے اور علم کی دولت سے مالا مال کرنے کے لیے لوگ اپنے ننھے منے پھول سے بچوں کو ساتھ گھسیٹ کر اسکولوں کے چکر لگانے لگے۔ ایک صبح پڑوسی کو' اپنے روتے ہوئے بچے کو اسکول بھیجتے دیکھا تو بیگم نے کہا۔ ہمارے لڑکے کو بھی اسکول میں داخلہ دلانا ہے۔''

اس کی عمر ہی کیا ہے۔ ابھی اسے کھیل کود کر بڑا ہو لینے دو۔ 'میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''آئندہ ماہ وہ تین برس کا ہو جائے گا اور یہی عمر اسکول جانے کی ہے۔'' بیگم نے جواب دیا۔

بیگم کا جواب سن کر میں سوچنے لگا کہ ہمیں بچوں کو اسکول بھیجنے کی بہت جلدی ہوتی ہے۔ ہم انہیں بمشکل تین سال گھر پر برداشت کر پاتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ بچہ اپنی تیسری سالگرہ اسکول میں منائے۔ بعض والدین اتنے اتاولے ہوتے ہیں کہ تین سے پہلے ہی بچوں کو پری پریٹری اسکول میں داخل کروا دیتے ہیں۔ ہمیں خدشہ رہتا ہے کہ اگر اسکول بھیجنے میں جلدی نہ کی گئی تو بچہ مسابقت کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا۔ ماہرین کہتے ہیں کہ ہم بچوں کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔ انہیں کم از کم مزید دو سال کھیلنے کودنے دینا چاہیے۔ امریکا میں یہی کیا جاتا ہے۔ وہاں بچوں کو پانچ بلکہ چھ برس سے پہلے اسکول نہیں بھیجا جاتا' لیکن میرے ایک دوست' امریکا میں ہم سے دو برس بعد اسکول بھیجنے کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ تین سال کا بچہ ٹھیک سے بندوق نہیں پکڑ پاتا ہے۔

''آج ہی آپ دو چار اچھے اسکولوں کے داخلہ فارم لیتے آیئے.....'' ساتھ ہی بیگم نے چند مشہور اسکولوں کے نام گنائے۔ داخلہ فارم کی فرمائش کا مطلب ہوا کہ بیگم بچے کو تین سال کی عمر ہی سے اسکول بھیجنا چاہتی ہیں۔ اس کے باوجود میں نے بیگم کو ماہرین کے مشورے سے واقف کروانا ضروری سمجھا..... میں نے بیگم سے کہا: ''بڑھتے ہوئے بچوں پر وقت سے پہلے تعلیم کا بوجھ نہیں لادنا چاہیے۔ ہم دو سال بعد بیٹے کو اسکول بھیجیں گے۔''

''اس وقت تک اچھے اسکولوں میں داخلے بند ہو چکے ہوں گے اور ہمارے لڑکے کو سرکاری اسکول میں داخلہ لینا پڑے گا۔ میں اپنے بیٹے کی زندگی خراب نہیں ہونے دوں گی۔ آپ فارم لے آئیں گے یا میں خود یہ کام کرلوں۔'' بیگم نے فیصلہ سنانے کے ساتھ دھمکی بھی دی۔

نامور اسکول کے فارم کا حصول جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ بعض اسکول صرف دو یا تین دن ہی فارم فروخت کرتے ہیں۔ فارم حاصل کرنے کے لیے طویل قطار لگتی ہے۔ کئی کلومیٹر کا فاصلہ کھسکتے ہوئے طے کر کے کاؤنٹر تک پہنچنا پڑتا ہے۔ چند اسکولوں کے داخلہ فارم بہت آسانی سے، کسی مشہور کمپنی کے شیئرز فارم کی طرح، خریدے جاسکتے ہیں لیکن ان اسکولوں میں داخلہ شیئرز کی طرح مشکل سے ملتا ہے۔ صرف خوش قسمت بچے ہی ان میں داخلہ لے پاتے ہیں۔ دو ایک اسکولوں کے داخلہ فارم کی قیمت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ صرف اہل زر ہی انہیں خرید پاتے ہیں۔ اسی لیے کہنے والے کہتے ہیں کہ داخلہ فارم بھی اسکول کی آمدنی کا ایک ذریعہ ہے۔

زرِ کثیر صرف کر کے اور پسینہ ٹپکا کر میں دو اسکولوں کے فارم لے آیا۔ داخلہ فارم بہت بڑے تھے۔ کئی باتوں کی تفصیل مانگی گئی تھی اور ہمہ اقسام کے مختلف سوالات پوچھے گئے تھے۔ بچہ کب، کیوں اور کن حالات میں پیدا ہوا تھا۔ ڈیلیوری کیسے ہوئی۔ پیدائشی وزن کیا تھا اور اب وزن کیا ہے۔ لڑکا کتنا لانبا ہے۔ پیدائش کے وقت سر کا محیط کیا تھا اور اس میں اب تک کتنا اضافہ ہوا ہے۔ بچے کی صحت کیسی رہتی ہے۔ مہینے میں کتنی مرتبہ بیمار پڑتا ہے اور کتنی مرتبہ بستر گیلا کرتا ہے۔ کیا اسے نیکر پہننا آتا ہے۔ کیا بٹن لگا سکتا ہے۔ کیا وہ جوتے کی ڈوریاں باندھ سکتا ہے۔ وہ خود کھاتا ہے یا اسے کھلانا پڑتا ہے۔ بچے کو کیا کھلاتے اور پلاتے ہیں۔ سیر و تفریح کے لیے بچے کو کہاں لے جاتے ہیں۔ کیا بچہ کبھی بیرون ملک گیا ہے۔ بچے کے کتنے بھائی بہن ہیں اور وہ کیا کرتے ہیں۔ اگر اس اسکول میں نہیں ہوں تو کیوں نہیں ہیں۔ گھر اور پاس پڑوس کا ماحول کیسا ہے۔ پڑوسیوں کے بارے میں بتلایئے۔ ماں اور باپ کون ہیں۔ کیا ان میں پہلے سے رشتہ داری ہے۔ انہوں نے کیا اور کہاں تعلیم پائی ہے۔ کام کیا کرتے ہیں۔ ان کے درمیان تعلقات کیسے ہیں۔ ہفتہ میں کتنی بار لڑتے ہیں۔ مادری زبان کیا ہے۔ گھر اور محلے میں کون سی زبان بولی جاتی ہے۔ ماں باپ کو کتنی زبانیں آتی ہیں۔ اسکول میں تعلیم کے علاوہ کیا گھر پر بچے کو کوئی اور تعلیم دی جائے گی۔ اسکول سے گھر کتنی دور ہے۔ بچہ اسکول کیسے آئے گا۔ ساتھ کون آیا کریں گے۔ وغیرہ، وغیرہ۔ بہت سوچ سمجھ کر اور آپس میں صلاح و مشورہ کر کے تین چار گھنٹوں میں ہم نے فارم پُر کیا اور بچے کی پیدائش' اس کے وجود اور دیگر معلومات کو ثابت کرنے کے لیے صداقت ناموں کو منسلک کر کے فارم کو اسکول میں جمع کروادیا۔

اسکول والوں نے داخلہ فارم لے لیا تو ہم خوش ہوئے کہ ہمارے لڑکے کو داخلہ مل گیا ہے۔ لیکن کلرک نے فارم کی وصولی کی رسید دیتے

ہوئے کہا: ''فارم کے قبول ہونے یا مسترد ہونے کی اطلاع آپ کو ڈاک کے ذریعہ دی جائے گی۔''

''کیا مطلب، کیا داخلہ فارم مکمل نہیں ہے۔'' میں نے استفسار کیا۔

''فارم مکمل ہے۔ اسی لیے تو لے لیا ہے۔ اگر آپ اور آپ کی فراہم کردہ معلومات ہمارے معیار اور کسوٹی پر پوری اتریں، تو آپ کو انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا۔ بصورت دیگر ہم آپ سے معذرت کرلیں گے۔'' کلرک نے وضاحت کی۔

ہم ہر دن دعا کرنے لگے کہ ''یا اللہ..... تو ہمیں اور ہماری اولاد کو اسکول کے معیار پر کھرا اتاریو۔'' ہماری دعا قبول ہوئی۔ تین چار ہفتوں بعد ڈاک کے ذریعہ ہمیں اسکول کا لفافہ ملا۔ کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل سے لفافہ وصول کیا۔ پھر دعا کر کے لفافہ کھولا۔ خدا کے فضل و کرم سے ہم اسکول میں داخلہ لینے کے اہل ثابت ہوئے اور ہمیں انٹرویو کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ ہم سب بہت خوش ہوئے اور بیگم اپنے بیٹے کو چومنے اور بلائیں لینے لگیں۔

ہمیں اسکول میں داخلے کے لیے انٹرویو دینے کا تجربہ نہ تھا۔ ایسا ہمارے ساتھ پہلی مرتبہ ہو رہا تھا۔ ہم نے تجربہ کار لوگوں کو ڈھونڈا جو اپنے بچوں کو اسکول میں داخلہ دلوا چکے تھے۔ ہم نے اپنے انٹرویو کی تیاری کے لیے ان کا انٹرویو کیا۔ سینئر لوگوں نے بتایا کہ اسکول میں داخلہ کے لیے انٹرویو کا بس نام ہوتا ہے۔ دراصل یہ ایک سخت قسم کا امتحان ہے۔ ماں، باپ اور بچے، تینوں سے مشکل سوالات کیے جاتے ہیں۔ ہم ڈرنے لگے تو احباب نے ہمت بندھائی۔ ''گھبرایئے مت..... انٹرویو اتنا بھی مشکل نہیں ہوتا۔ ہم آپ کی مدد کریں گے۔''

ہم نے انٹرویو میں کیے جانے والے سوالات کی نوعیت کے بارے میں پوچھا اور ممکنہ سوالوں اور ان کے جوابوں کو لکھ لیا۔ یہ بھی دریافت کیا کہ انٹرویو دینے کے لیے کون سے کپڑے پہن کر جائیں اور اپنے ساتھ کوئی تحفہ لے جانے کے لیے مشورہ مانگا۔ ایسا کرنے سے ہمیں منع کر دیا گیا۔ ''آپ کے ساتھ دوسرے والدین بھی ہوں گے۔ سب کے سامنے تحفہ دینے سے بات بگڑ سکتی ہے، لیکن آپ انٹرویو کے دوران بعد میں تحفے تحائف دینے کا وعدہ ضرور کرلیں۔''

میں نے دفتر سے پندرہ دن کی چھٹی لی اور انٹرویو کے لیے ہم تیاری کرنے لگے۔ بیگم اپنے لڑکے کو انگریزی سکھانے لگیں کہ اب اس کا داخلہ انگلش میڈیم اسکول میں ہونے والا ہے۔ وہ بچے سے انگریزی میں ہمکلام ہونے لگیں اور مجھے بھی ہدایت کی کہ میں بھی اس سے انگریزی ہی میں بات کروں۔ بیگم نے لڑکے کو اے ٹو زیڈ حروف یاد کروائے۔ ون ٹو ہنڈرڈ گنتی بتائی۔ رنگوں کی انگریزی میں پہچان کرائی۔ آنکھ، ناک، کان، سر، ہاتھ، پیر وغیرہ کے انگریزی متبادل الفاظ رٹائے۔ اپنا نام، باپ کا نام، گھر کا پتا، ٹیلی فون نمبر اور تاریخ پیدائش کو انگریزی میں بولنا سکھایا۔ احباب نے بتایا کہ بچے کے لیے اتنی انگریزی کافی ہے۔ اسے کنڈر گارٹن ہی میں تو داخلہ لینا ہے۔

بیگم نے بھی خوب تیاری کی۔ مختلف ملکوں کے سربراہان حکومت کے نام، یوم آزادی، خواندگی کا فیصد وغیرہ کے حوالے سے معلومات اکٹھی کیں۔ موجودہ سیاسی حالات اور انسدادِ دہشت گردی کے بارے میں واقفیت حاصل کی۔ بچوں کو دنیا کے امن پسند اور سیکولر شہری بنانے کے طریقوں کو یاد کیا۔ اتنی تیاری کے باوجود بیگم خوف زدہ تھیں کہ معلوم نہیں انٹرویو میں کیا پوچھ لیا جائے گا۔ انہیں یہ فکر بھی کھائے جا رہی تھی کہ اگر

انٹرویو میں پوچھ لیا گیا کہ صدام حسین کہاں ہے تو وہ ناکام ہو جائیں گی۔

میں نے بھی انٹرویو میں پیش ہونے کی تیاری کی۔ دفتر سے کام اور آمدنی کا صداقت نامہ اور بینک سے نئی چیک بک حاصل کی۔ تجربہ کار دوستوں نے بتایا کہ میری اتنی تیاری کافی ہے۔ اس سے زیادہ محنت بے کار ہوگی۔ احباب نے مشورہ دیا کہ اگر محنت کرنا ہی ہے تو اوور ٹائم کر کے مزید کچھ پیسوں کا بندوبست کر لوں۔

انٹرویو کا دن آ پہنچا۔ ہم نے نہا دھو کر نئے کپڑے زیب تن کیے اور اپنے آپ کو معطر کر کے سجے سجائے اسکول پہنچے۔ وہاں اور بھی بچے اپنے والدین کے ساتھ انٹرویو دینے کے لیے موجود تھے۔ انتظار کا وقت ہم نے دعائیں کرتے گزارا۔ خاصی دیر بعد ہمیں انٹرویو کے لیے طلب کیا گیا۔ انٹرویو لینے والوں کی خدمت میں ہم نے کورس میں گڈ مارننگ کہا۔ جواب میں ''ویری'' کا اضافہ کر کے گڈ مارننگ لوٹائی گئی۔ ٹیچر نے لڑکے کو مسکرا کر دیکھا اور پوچھا:

''کیا تمہیں انگریزی آتی ہے؟''

لڑکے کی بجائے ماں نے انگریزی میں جواب دیا: ''یس میڈم' آپ میرے لال سے انگریزی میں بات کریں۔''

لڑکے سے انگریزی میں نام، فادر کا نام، تاریخ پیدائش اور پسندیدہ کھانا پوچھا گیا جو اس نے فر فر بتا دیا۔ کالے اور پیلے رنگ کو پہچاننے اور ناک اور کان پکڑنے کے لیے کہا گیا۔ اس نے یہ کام آسانی سے کر دیے۔ پھر اس سے ایپل اور کیٹ کے ہجے پوچھے گئے۔ لڑکے نے یہ معرکہ بھی سر کر لیا۔ ٹیچر کبھی گڈ تو کبھی ویری گڈ کہتی رہیں۔ لڑکے کا انٹرویو ختم ہوا۔ اسے امتیازی نشانات حاصل ہوئے۔ ٹیچر نے پیٹھ تھپتھپائی تو لڑکا خوش ہوا اور ماں کا چہرہ دمک اُٹھا۔

بیگم کی باری آئی۔ ان سے چند سوالات کیے گئے۔ آپ بچے کو پڑھانے کے لیے کتنا وقت دیں گی۔ کیا ہر دن چار گھنٹے کافی ہوں گے۔ بچے کو اس عمر میں کتنی نیند درکار ہوتی ہے۔ کون سی غذا سے دماغی صلاحیت میں چار چاند لگتے ہیں۔ ملک کا وزیر تعلیم کون ہے۔ بیگم نے تمام سوالوں کے تشفی بخش جوابات دیے۔ اس طرح بیگم بھی سرخرو ٹھہریں۔

اب جگر تھام کے بیٹھو، مری باری آئی والا معاملہ تھا۔ ایک صاحب جو اب تک خاموش بیٹھے تھے، گلا صاف کر کے مجھ سے بات کرنے لگے۔ قابلیت اور کام کے حوالے سے پوچھا اور ڈھکے چھپے سوالات کر کے آمدنی کا اندازہ لگایا۔ اس اندازے کے مطابق میری آمدنی ان کے نزدیک غالباً مناسب نہ تھی' اس لیے انہوں نے سیدھا سوال داغا: ''کیا آپ بچے کی تعلیم کا خرچ برداشت کر سکیں گے؟''

جواب دینے بلکہ وعدہ کرنے سے پہلے میں نے داخلے کا خرچ اور اسکول کی فیس دریافت کی۔ انہوں نے اتنی رقم بتائی کہ میرے ہوش اُڑ گئے۔ بچے کی ماہانہ تعلیم کا خرچ برداشت کرنے کے بعد ہمیں صرف چنے کھا کر اور پانی پی کر گزارہ کرنا پڑتا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ اچھے اسکول میں معیاری تعلیم اتنی مہنگی ہوتی ہے۔ مجھے شک ہوا کہ میں نے غلط سنا ہوگا۔ میں نے سوال دہرایا تو جواب بھی دہرایا گیا' لیکن تعلیم کے خرچ میں کمی بیشی نہیں ہوئی۔

مکرر جواب سن کر بھی مجھے یقین نہ آیا اور میں بے اختیار بول اُٹھا: ''میں نے اسکول خریدنے کی بات نہیں کی ہے۔ میں آپ کے اسکول میں صرف اپنے لڑکے کو تعلیم دلوانے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔''

صاحب موصوف نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور سنجیدگی سے فرمایا: ''جی میں نے تعلیم کا خرچہ ہی آپ کے گوش گزار کیا ہے۔ آپ کی حیرانی دیکھ کر اندازہ کر سکتا ہوں کہ آپ بھلا اسکول کیا خرید پائیں گے!''

میں کچھ دیر یوں ہی گم صم بیٹھا رہا اور پھر ''شکریہ..... میں سوچ کر بتاؤں گا۔'' کہہ کر بیگم اور لڑکے کو ساتھ لیے بوجھل قدموں سے اسکول سے باہر نکلنے لگا۔

لڑکے نے میرا ہاتھ تھام کر پوچھا: ''ڈیڈی..... کیا میں پاس ہوا؟''

میں نے اسے گود میں لے کر کہا۔ ''ہاں بیٹا آپ پاس ہوئے اور ممی بھی پاس ہوئیں لیکن میں فیل ہو گیا۔''

اپنی داستان مکمل کر کے میں نے چچا کی جانب دیکھا کہ وہ میری ناکامی پر پچیس برس پہلے کی طرح برس پڑیں گے لیکن وہ بھی نظریں جھکائے گم صم تھے۔

☆☆☆

محمود احمد مودی کے قلم سے
رومانی، سماجی اور معاشرتی ناول
خلش
قیمت 150/- روپے

پانچواں اور چھٹا حصہ شائع ہو گیا ہے
احمد اقبال کے قلم سے
جاسوسی اور ایڈونچر سے بھرپور تہلکہ خیز سلسلہ
مداری
قیمت فی حصہ 60/- روپے

چالاک خرگوش

چالاک خرگوش مشہور اردو افسانہ نگار کرشن چندر کی لکھی ہوئی ننھے منے بچوں کے لیے طویل، اور اخلاقی کہانی ہے۔ جسمیں جانوروں کے کرداروں کی مدد سے سبق آموز باتیں سکھائی گئی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے حصوں پر مشتمل یہ طویل کہانی کتاب گھر کے بچوں کے ادب (**بزم اطفال**) سیکشن میں پڑھی جا سکتی ہے۔

اب کہاں یاری کی ہے وہ رسم وراہ!

الیف۔اے۔انوری

یکوں اور تانگوں کا زمانہ یاد ہے۔ وہ گھوڑوں کی ٹاپ، وہ تانگے والوں کی پکار.....دوآنے سواری.....دوآنے سواری! میری جیب میں کبھی دوآنے نہ ہوتے۔ اسکول گھر سے چار میل دور تھا۔ سائیکل کا خیال تو خواب تھا اور میں اس خواب سے ہی خوش تھا۔ چنانچہ وہ حسین اور خوش انجام شام میری زندگی میں کبھی رات کی تاریکی میں نہیں بدل سکتی، جب میں اپنے والدین کے ساتھ اپنے نئی نویلی بائیسکل تانگے میں لاد کر گھر جا رہا تھا۔ یہ میڈیم سائز ''فلپس اپالو'' سائیکل میری دنیا بدلنے کا عزم رکھتی تھی۔

سڑک پر دو ایک موٹر کاریں فراٹے بھرتی ہوئی گزریں جو مجھے اپنی سائیکل کے سامنے ہیچ دکھائی دیں۔ میرے والد نے پوچھا: ''تم جانتے ہو یہ موٹر کاریں کن لوگوں کے پاس ہوتی ہیں؟'' پھر خود ہی جواب دیا: ''جو لوگ محنت مشقت سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ پڑھنے کے وقت پڑھتے ہیں اور کھیلنے کے وقت کھیلتے ہیں۔ مقابلے کے امتحان پاس کر کے اونچے عہدوں پر پہنچتے ہیں۔'' مگر میرے ذہن پر اس وقت میری چمکتی دمکتی نئی بائیسکل سوار تھی۔

مجھے اپنی بائیسکل سے عشق تھا۔ کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتا تھا۔ اس کے کیریئر پر بستہ باندھ کر اسکول جاتا اور چھٹی کے بعد گھر آ کر کھانا کھانے سے پہلے اسے صاف کرتا، چمکاتا۔ میں نے اپنے معمولی سے جیب خرچ اور عیدیوں میں سے ایک ایک پیسہ بچا کر اس کی ٹن ٹن کرنے والی گھنٹی خریدی۔ مٹی کے تیل سے چلنے والا لیمپ خریدا۔ میں اپنی والدہ کی سلائی کی مشین والی تیل کی کپی چرا کر سائیکل کے کل پرزوں میں تیل ڈالتا۔ پہیوں کے رمز اور زنجیر پر تیل کی مالش کرتا کہ زنگ سے محفوظ رہیں۔ اس کے ہینڈل چمکاتا۔

محلے میں نان بائی کا بیٹا بشیرا کئی دفعہ میری سائیکل پر سواری کرنے کی خواہش کر چکا تھا اور میں اسے دھتکار چکا تھا۔ بشیرا مجھ سے عمر میں بھی بڑا تھا اس لیے دھونس بھی جماتا تھا۔ بشیرا میرے ساتھ مسجد کے مدرسے میں مولوی صاحب سے قرآن شریف بھی پڑھتا تھا اور کبھی کبھی فٹبال کے کھیل میں بھی شامل ہو جاتا تھا۔

ایک دفعہ اسکول آنے جانے والی سڑک کے حصے میں مرمت ہو رہی تھی۔ یہ ٹکڑا کھدا پڑا تھا۔ میں سائیکل سے اتر کر اسے آہستہ آہستہ دھکا دیتا ہوا یہ حصہ طے کر رہا تھا کہ بشیرا کہیں سے نمودار ہوا۔ مجھ سے میری بائیسکل جھپٹ لی اور اس پر سوار ہو کر بولا:

''اب بتا، بچو!''

اپنی سائیکل کو اس بے دردی سے ادھڑی ہوئی سڑک پر دوڑتا دیکھ کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ بچاری سائیکل کی ہڈی ہڈی کراہ رہی ہوگی۔ بشیرا نے سائیکل پر سوار ہو کر دو چار چکر لگائے۔ سائیکل کو ایک کونے میں پھینکا اور غائب ہو گیا، مگر میرے دل میں انتقام کی آگ جل اٹھی اور میں نے

اپنی سائیکل کے ساتھ اس گستاخی کا بدلہ لینے کی ٹھان لی۔

جاڑوں کے دن تھے۔ فجر کے وقت اسکول جانے سے دو گھنٹے پہلے ہم لڑکے لڑکیاں مل کر مسجد کے مدرسے میں قرآن شریف پڑھنے جاتے۔ اگلے دن میں نے اپنے کوٹ کے اندر ایک مضبوط اور موٹا سا رولر چھپا لیا۔ مدرسے سے باہر نکلے تو بشیرا آگے آگے تھا۔ میں نے پیچھے سے اس کے کولہوں پر دو چار ایسی ضربیں لگائیں کہ بدھیاں پڑ گئی ہوں گی۔ وہ بلبلایا۔ میرے ہاتھ میں رولر دیکھ کر وہ بھاگا اور اپنے گھر میں گھس گیا۔

شام کو ابا جان دفتر سے آئے تو بشیرا کا باپ بشیرا کو ساتھ لے کر میری شکایت لے کر آیا۔ بشیرا نے اپنی بدھیاں دکھائیں۔ میں نے اپنی صفائی پیش کی۔ ابا جان نے فیصلہ صادر کیا:

''اب تمہاری سزا یہ ہے کہ تم دس منٹ کے لیے اپنی سائیکل بشیرا کے سپرد کرو۔ وہ بھی تم جیسا لڑکا ہے۔ اسے بھی سائیکل کی سواری کا شوق ہوگا مگر اس کا باپ اس کے لیے سائیکل نہیں خرید سکتا۔ یہ انسانی ہمدردی کا تقاضا ہے اور میں تم سے انکار سننا نہیں چاہتا۔''

وقت گزرتا رہا۔ اسکول کے بعد کالج، کالج کے بعد یونیورسٹی، کچھ عرصے کے بعد میں چھٹیوں میں گھر آیا تو دیکھا کہ نان بائی کی دکان پر بشیرا نے اپنے باپ کی جگہ سنبھال لی ہے۔ مجھے آتا دیکھ کر بشیرا اپنے تھلے کو پھلانگ کر اترا اور مجھ سے چمٹ کر کہنے لگا: ''یار کہاں غائب ہو گیا تھا! تیرے بغیر تو محلّہ سُونا ہو گیا۔ آج تجھے میرے ہاتھ کی پکی بریانی چکھنی ہوگی۔ ایمان سے، مزہ آجائے گا۔''

بشیرا نے مجھے زبردستی دکان کے باہر بنچ پر بٹھایا اور بریانی بھری پلیٹ اور برف کے پانی کا گلاس میرے ساتھ رکھ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ کہنے لگا: ''یار، بریانی کیسی لگی۔ تیری دعا سے دکان اسی مزیدار بریانی کی وجہ سے چل نکلی۔ بابا کی روح خوش ہوگئی ہوگی۔ یار آج رات کا کھانا میرے گھر کھا۔ تجھے تیری بھابی سے ملاؤں گا..... یار وہ شیخ جی عبدالرحمٰن کی بیٹی ثریا تھی نا؟ اب وہ میری بیگم ہے۔ ارے یار اللہ نے ہمیں بیٹا دیا ہے! تو بتا تو بیاہ شادی کب رچا رہا ہے۔؟''

میں نے بشیرا کو باپ کا پُرسا دیا۔ شادی اور باپ بننے پر مبارکباد دی اور کہا: ''بشیرا یار میری بچپن کی اُس حرکت کو معاف کر دے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا' تیرے اتنی چوٹ لگے گی۔ میں سوچتا ہوں تو مجھے دکھ ہوتا ہے۔''

بشیرا بولا: ارے یار۔ بچپن کی لڑائی جیسے دودھ کی ملائی۔ اِدھر گئی اُدھر آئی۔ یار اغیر کی گالی بھی بری لگتی ہے۔ یار کے طمانچے میں بھی مزہ آتا ہے! یار اتو مجھے معاف کر دے۔ تیری سائیکل چھین کر بہت پچھتانا پڑا۔ تو نے اچھا ہی کیا میری پٹائی کر ڈالی' اچھا یہ بتا۔ آج شام میرے گھر آئے گا نا؟''

میں نے بریانی کھا کر بشیرا کو دو روپے دینے چاہے تو اس نے روپے لے کر میری جیب میں ڈال دیے اور کہنے لگا: ''ارے یار تیرے لیے تو میری دکان حاضر ہے! تیری میری دوستی تو بچپن کی دوستی ہے۔ دوستوں میں روپیہ پیسہ بھلا کیا حقیقت رکھتا ہے۔''

یہ بھی حقیقت ہے کہ یونیورسٹی جا کر جب ذہن میں پختگی آئی تو بچپن کا ایک ایک واقعہ نظر ثانی کے لیے ذہن میں ابھرا۔ بچپن کے دوست ذہن میں جگہ حاصل کر رہے تھے۔ ابا جان مرحوم نے کیسی اچھی بات کہی تھی کہ بشیرا بھی تم جیسا لڑکا ہے۔ تمہاری طرح وہ بھی تمہاری طرح

بائیسکل کے خواب دیکھتا ہوگا مگر اس کا باپ اس کے لیے سائیکل نہیں خرید سکتا۔ یہ نامیسری کا دکھ بھی بڑا دکھ ہے۔ دل سے ایک آہ نکلتی ہوگی۔

سب کی تو آرزوئیں پوری کیں
پھر ہمارا ہی دل رکھا نہ کبھو

چھٹیاں ختم ہوئیں۔ میں واپس ہاسٹل چلا گیا۔ مجھے حضرت ذوقؔ کا یہ شعر بہت پسند تھا۔

سینہ چرخ میں ہر اختر اگر دل ہے تو کیا
ایک دل ہوتا مگر درد کے قابل ہوتا

ہاسٹل لوٹ کر میں نے اپنے دل سے وعدہ کیا کہ اگر کسی قابل بن سکا تو پہلی فرصت میں بشیرا کو کچھ روپیہ دوں گا کہ اپنی دکان میں کچھ اور وسعت پیدا کر سکے۔

☆

جب میں اپنی پہلی موٹر کار خرید کر اسے خود چلاتا ہوا گھر آ رہا تھا تو بشیرا کی دکان کے سامنے رکا۔ بشیرا لپک کر آیا۔ کار پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا اور بولا: ''یار ایک بات بتاؤں' سائیکل سے زیادہ مجھے تو اس کار میں اچھا لگ رہا ہے۔ تیری اپنی کار معلوم ہوتی ہے۔ یارا بہت بہت مبارک!''

میں کار سے اترا بشیرا کو دکان میں لے گیا۔ پانچ سو روپے اسے پیش کیے تو وہ بولا: ''یارا یہ کیا؟'' میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور کہا: ''بشیرا بھائی، میرا دل چاہتا ہے کہ تیری دکان بھی اندر باہر سے خوبصورت نظر آنے لگے۔ یہ ایک بچپن کے دوست کا حقیر سا تحفہ ہے۔ انکار مت کی جیو۔''

بشیرا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ مشکل سے جذبات پر قابو پا کر لرزتے ہونٹوں سے کہنے لگا: ''بھیا تیرا تحفہ میرے سر آنکھوں پر مگر..... میں ان روپوں سے صغیرا کے لیے تیری جیسی سائیکل خرید سکتا ہوں..... مگر میرا دل چاہتا ہے کہ اگر تیری سائیکل ابھی تیرے گھر میں پڑی ہے تو تو اپنے ہاتھوں سے میرے لڑکے صغیرا کے ہاتھ میں پکڑا دے۔''

میری پرانی سائیکل..... وہی فلپس اپالو جو کسی زمانے میں میرے ذہن پر چھائی ہوئی تھی' ہمارے گھر کے گودام میں موجود تھی۔ میں نے اس پر رنگ و روغن کرایا۔ پرانے کل پرزوں کی جگہ نئے چمکدار کل پرزے لگوائے۔ بشیرا کے گھر گیا اور سائیکل صغیرا کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ پانچ سو روپے جو بشیرا نے مجھے واپس لوٹائے تھے وہ میں نے اس کی بیوی کو دیے اور بشیرا سے کہا:

''میرے دوست میں تیری شادی میں شرکت نہ کر سکا۔ اب انکار کی گنجائش نہیں۔ یہ رقم بھابی اور بچوں کی منہ دکھائی ہے۔''

☆☆☆

یوں ہی گر روتا رہا.....!

سید نصرت آرکیٹیکٹ

رونا ہر انسان کا پیدائشی حق ہے' جسے وہ پیدا ہونے سے لے کر ملک الموت سے مصافحہ کرنے تک بے تحاشا استعمال کرتا ہے! رونے کی بنیادی وجہ ایک نومولود کے پاس بھوک، نوجوان کے پاس شادی شدہ زندگی اور بوڑھوں کے پاس یادِ ایام جوانی ہوتی ہے! بچوں کے رونے دھونے کے انداز سے ہم اس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس بچے کا مستقبل کیا ہوگا' چنانچہ جو بچے اوزان میں روتے ہیں' یعنی سر تال میں آواز کے اُتار چڑھاؤ اور مرکیوں سے اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ رونا نہ صرف ایک آرٹ ہے بلکہ دوسروں کو متوجہ کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ بھی ہے تو سمجھ لیں کہ ایسے بچے بڑے ہو کر ضرور مترنم شاعر بننے والے ہیں یا 'موسیقی' کے شعبے سے وابستہ ہوں گے' اسی طرح جو بچے دھیمے سروں میں اور ہلکے ہلکے احتجاجی طریقوں سے رو رو کر اپنی ماؤں کو متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں' وہ بڑے ہو کر ناول نگار یا افسانہ نگار بن جاتے ہیں۔

کچھ بچوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ پہلے تو گلا پھاڑ کر رونا شروع کرتے ہیں' پھر مارے غصے کے کئی چیزیں توڑ پھوڑ دیتے ہیں' تو ایسے بچوں کو بڑے ہو کر نقاد بن جانے میں خاصی سہولت ہوتی ہے! کچھ بچے ایسے ہوتے ہیں جو بالکل ہی نہیں روتے (یعنی ان کے گلوں میں سوز و گداز نام کی کوئی چیز موجود ہی نہیں ہوتی) اور وہ ہر بات کو بڑی خاموشی اور صبر سے قبول کر لیتے ہیں۔ انہیں اس بات کی بھی بالکل پروا نہیں ہوتی کہ وقت پر دودھ ملا ہے یا نہیں تو ایسے بچوں کو بڑے ہونے پر ایک سعادت مند شوہر کی سند مل جاتی ہے! کچھ بچوں کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ رونے کے میدان میں اپنے موڈ کے تابع ہوا کرتے ہیں' یعنی دل چاہا تو رو لیے اور دل نہ چاہا تو محض اُداس ہو لیے' تو سمجھ لیں کہ ایسے بچے بڑے ہو کر صرف اور صرف فلسفی بننے والے ہیں۔ بہت ہی کم بچوں کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو روتے روتے یکدم ہنس پڑتے ہیں اور اپنے اس طرزِ عمل سے دوسروں کو بھی ہنسا دیتے ہیں' تو ایسے بچے بڑے ہو کر یا تو مزاح نگاری کرتے ہیں یا پھر پاگل بن جاتے ہیں۔

کچھ بچے ایسے بھی ہوتے ہیں' جو دوسرے روتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر خود بھی رونے کی اداکاری کرتے ہیں اور نتیجتاً ان کے گلے سے ہنسی اور رونے کی ملی جلی آواز پھوٹ پڑتی ہے' جو اس بات کی طرف نشاندہی کرتی ہے کہ ان کا مستقبل سیاسی داؤ پیچ میں گزرنے والا ہے اور وہ لیڈر بننے والے ہیں۔ جدید شعراء کا بچپن اگر کسی نے دیکھا ہے' تو وہ بخوبی جانتا ہے کہ جدید شاعری کی طرف راغب ہونے والا بچہ کبھی بھی سر تال اور ترنم میں نہیں روتا بلکہ گھگیا کر رونا اور بلک بلک کر ٹسوے بہانا' اس کا وتیرہ ہوتا ہے۔

عشق و عاشقی کے نصاب میں رونا دھونا ایک لازمی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر عاشق کو عشق کے دیگر لوازمات (جیسے بٹوے کا لباب ہونا (یا بالکل خالی) ہونا، بال بے تحاشا بڑھا لینا، گریباں چاک چاک ہونا اور وقتاً فوقتاً آہ و زاری میں مبتلا ہونا) کے ساتھ ساتھ رونے دھونے میں بھی مہارت ضروری ہوتی ہے تاکہ وہ اپنے آنسوؤں کے سیلاب میں اپنی محبوبہ دلنواز کو بہا لے جائیے۔ عاشق برادری کی طرح شاعر حضرات اور

خواتین (شادی شدہ اور کنواری) دونوں طبقوں کے لیے رونے دھونے کے طریقوں کو جاننا اور سیکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کسی مراسلہ نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق نہ ہونا۔

لڑکوں کی طرح لڑکیوں کا مستقبل بھی اُن کے رونے دھونے کے طور طریقوں سے بآسانی پہچانا جاسکتا ہے' چنانچہ جو بچی گلا پھاڑ کر روتی ہے' وہ بڑی ہو کر ایک کامیاب لڑاکا پڑوسن بن جاتی ہے! اور جو بچیاں رونے کے دوران آنسو بھی بہاتی ہیں' وہ مستقبل میں ایک ماہر گرہست خاتون کا روپ دھار لیتی ہیں' جو شوہر کی جھڑکیوں اور سسرال کی بہتان طرازیوں پر رو رو کر اپنے آنسوؤں کو تکیے میں جذب کرنے کا گر بخوبی جانتی ہیں۔ جو بچیاں پوتڑوں کو گیلا کرنے کے بعد بے اختیار رو پڑتی ہیں' وہ بڑی ہو کر سماج کی اصلاح و سدھار کو اپنا شعار بنا لیتی ہیں۔ پاؤں پٹک پٹک کر رونے والی بچیاں بڑی ہو کر سیاست کے میدان میں کود پڑتی ہیں اور اپنی ہٹ دھرمیوں کے باعث بہت جلد عوام میں مقبول ہو کر اُن کے ذہنوں سے بہت جلد اُتر بھی جاتی ہیں۔ شاعرات کا بچپن تو ہم نے اب تک نہیں دیکھا کہ وہ کس طرح روتی ہیں کیونکہ شاعرات ہماری پیدائش کے بہت بعد عالم وجود میں آئی ہیں (اس میں سراسر ہمارا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔) البتہ گمان غالب ہے کہ شاعرات اپنے بچپن میں انتہائی رومینٹک موڈ میں ترنم سے روتی ہوں گی۔

رونے دھونے سے قبل ایک مرحلہ اور بھی ہوتا ہے' جس میں آہ وزاریاں کی جاتی ہیں اور ٹھنڈی ٹھنڈی آہوں کے ساتھ وقفے وقفے سے آنکھیں بھی گیلی ہونے لگتی ہیں۔ یہ مرحلہ درحقیقت رونے دھونے کا آزمائشی منظر ہوتا ہے اور رونے دھونے میں مہارت حاصل کرنے کے لیے اس آزمائشی منظر میں صد فیصد کامیابی حاصل کرنا از حد ضروری ہے۔

آہ وزاری کا درجہ شعراء کرام کے لیے کافی اہمیت رکھتا ہے اور وہ ہمیشہ عشق میں مبتلا ہونے کے بعد انفرادی یا اجتماعی آہ وزاریاں کرنا ضروری گردانتے ہیں۔ چنانچہ چچا غالبؔ جب بھی کوئی عشق فرماتے تو آہ وزاری کی منزل پر پہنچ کر اپنی عزیز خادمہ عندلیب خانم کے ساتھ مل کر آہ وزاری کرنے کے آرزومند ہوتے تھے اور عندلیب خانم کو مخاطب کر کے یوں کہتے تھے۔

؎ آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل!

(کہتے ہیں کہ گل خاں' عندلیب خانم کا محبوب تھا!) اس کے جواب میں عندلیب یوں جواب دیتی۔ ''آہ وزاری مجھ سراپا ناز کا شیوہ نہیں'' یہ تو آپ کو ہی مبارک ہو۔ عندلیب سے مایوس ہو کر غالبؔ زار زار روتے جاتے اور کہتے جاتے۔

؎ یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

اور پھر غسل خانے میں بند ہو کر اچھی طرح رونے، دھونے کے بعد یہ شعر گنگناتے ہوئے نکلتے ہوں گے۔

؎ رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے

دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

کہتے ہیں کہ حضرت میر تقی میرؔ جب بہت ہی چھوٹے تھے تو دیگر خراب عادتوں کے ساتھ ساتھ ان میں ایک بری عادت یہ بھی تھی کہ وہ روتے روتے سو جاتے تھے، جس پر اُن کی والدہ ایک بڑی تختی پر حسب ذیل شعر لکھ کر میرؔ کے سرہانے احتیاط کے طور پر رکھ دیتی تھیں۔

؎ سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو

ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

ایک شاعر صاحب کو جب کبھی رونے دھونے کی حاجت درپیش ہوتی تو وہ خود کو تکلیف دینے کی بجائے، کسی ایسے ادارے کی تلاش میں سرگرداں رہتے، جو مناسب معاوضہ پر ان کا رونا رو سکے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

؎ رونے والوں سے کہو اُن کا بھی رونا رو لیں

جن کو مجبوری حالات نے رونے نہ دیا

اس کے برعکس حضرت طفیلؔ کا یقین ہے کہ۔

آنکھ نم ہو کہ نہ ہو اشک بہیں یا نہ بہیں

جن کو رونا ہے وہ ہر حال میں رو لیتے ہیں

حضرت ذوقؔ جب کبھی رونے پہ آتے تو شہر کے اعلیٰ حکام کو اپنے رونے کی پیشگی اطلاع دے دیا کرتے تھے تاکہ وہ آنے والے سیلاب کی ہولناکیوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہ سکیں کیونکہ اُن کا ایقان تھا کہ

؎ ہم رونے پہ آ جائیں تو دریا ہی بہا دیں

شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

خیر یہ تو حضرت ذوقؔ کا ہی ظرف تھا کہ وہ اس قدر دریائی رونا روتے تھے۔ فی زمانہ تو اکثر حضرات کو مختلف واقعات پر نالوں، نالوں، موسلا دھار بارش یا ستمبر کی جھڑی کی طرح بھی روتا ہوا پایا گیا ہے۔ کوئی اپنے دفتر کا رونا روتا ہے، تو کوئی گھر کا رونا، کسی کو مسلسل بڑھتی ہوئی مہنگائی پر رونا آتا ہے تو کوئی اپنی محبوبہ کی بے وفائی پر آنسو بہاتا ہے، ساس بہو کو روتی ہے تو بہو ساس کی زیادتیوں پر ٹسوے بہاتی ہے، بیوی نئی نئی ساڑھیوں اور زیورات کی عدم فراہمی پر اور اپنے شوہر کی نکمے پن پر روتی ہے تو شوہر اپنی قلیل تنخواہ کو دیکھ دیکھ کر بسورتا ہے۔

جس طرح کسی شادی شدہ عورت کو اس کے رکھ رکھاؤ اور چہرے پر اُمڈتی بشاشت سے بآسانی پہچانا جا سکتا ہے، اسی طرح کسی شادی شدہ مرد کی پہچان یہ ہے کہ اس کے چہرے پر ہمیشہ بے چارگی، حزن و ملال اور مردنی چھائی رہتی ہے۔ ایک دفتر ازدواج میں نکاح رجسٹرار نے دروازہ کھولا اور دفتر کے باہر کھڑے ہوئے آدمیوں میں سے ایک خوش پوش نوجوان کو اپنی طرف بلاتے ہوئے کہا: ''دولہا میاں تشریف لائیں۔''

''میں دولہا نہیں ہوں!'' نوجوان نے اعتراض کیا۔

رجسٹرار نے حیرت سے پوچھا: ''تو پھر تم رونی صورت بنائے کیوں کھڑے ہو؟''

اسی طرح ایک لڑکی نے اپنے محبوب سے کہا: ''ڈیئر میں تمہارے سارے غم اپنالوں گی اور تمہاری آنکھ میں ایک آنسو بھی نہ آنے دوں گی۔''

لڑکے نے کہا: ''لیکن مجھے تو کسی بات کا غم نہیں ہے۔''

لڑکی بولی: ''میں اب کی بات نہیں کر رہی ہوں بلکہ شادی کے بعد کا ذکر کر رہی ہوں!''

اسی طرح ایک صاحب کی بیوی جب ان کے ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی تو یہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ انہیں اس بات کی فکر کھائے جا رہی تھی کہ انہیں ڈرائیونگ بالکل نہیں آتی تھی۔

رونے دھونے کی مختلف کیفیتوں کے لیے زبانِ اُردو میں مختلف عنوانات رقم ہیں، جن میں سے چند ایک کی تشریح اور کیفیات کچھ اس طرح سے ہیں:

ایڑیاں رگڑ رگڑ کر رونا: انتخابات کے زمانے میں برسر اقتدار پارٹی کے ٹکٹ کے حصول کے لیے امیدواران کرام اسی قسم کا رونا روتے ہیں۔

بلک بلک کر رونا: انتخابات یا محبت میں ناکامی کے بعد کا رونا، بلک بلک کر رونا کہلاتا ہے۔

دھاڑیں مار مار کر رونا: بڑے اور اونچے گھرانوں کی لڑکیاں اپنے پالتو کتے یا بلی کی موت پر چیخ چیخ کر جو ماتم کرتی ہیں وہ دھاڑیں مار کر رونا کہلاتا ہے۔

سسک سسک کر رونا: اس قسم کا رونا خواتین میں بہت مقبول ہے۔ شوہروں سے کی گئی فرمائشوں کے پوری نہ ہونے پر خواتین کو اکثر و بیشتر سسکیاں لے کر روتے دیکھا جا سکتا ہے۔

گلا پھاڑ کر رونا: کسی مشاعرے میں کوئی انقلابی شاعر اپنی نظمیں چیخ چیخ کر ترنم سے پڑھتا ہے، تو اس کیفیت کو گلا پھاڑ کر رونا کہتے ہیں۔ اکثر گویئے اور قوال بھی اس بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں۔

ٹھنک ٹھنک کر رونا: غیر شادی شدہ لڑکیوں اور بوڑھوں کا اکثر اپنی خواہش اور ضد کے اظہار اور عدم تکمیل کے عوض جو رونا ہوتا ہے اس کو ٹھنک ٹھنک کر رونا کہتے ہیں، جو دیگر رونوں کی بہ نسبت زیادہ نقصان دہ نہیں ہوتا۔

مندرجہ بالا رونے کی قسموں کے علاوہ اور بھی بہت ساری قسمیں دنیا میں پائی جاتی ہیں اور ہر کوئی اپنے اپنے ظرف اور کمال فن کے لحاظ سے رونے کی قسم اور پیمانہ متعین کرتا ہے۔ ایک مشہور اور قدیم کہاوت ہے کہ روتی بسورتی عورت اور ہنستا مرد دونوں خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شادی شدہ خاتون اور کنوارہ مرد دونوں ناقابل بھروسا ہیں لیکن فی زمانہ یہ کہاوت کچھ اُلٹی ہو گئی ہے اور اب ہنستی عورت اور روتا مرد دونوں خطرناک بن گئے ہیں۔ کہاوت کا اُلٹ جانا کوئی نئی بات نہیں ہے، کہاوتیں بھی اتنی مصلحت کوشی کا شکار ہو چکی ہیں کہ زمانے کی شاطرانہ

چالوں کے ساتھ ساتھ اپنے معانی و مطالب بھی بدل دیتی ہیں' جس طرح ایک ہوشیار لیڈر انقلاب زمانہ کے سرد و گرم حالات میں پھنس کر رونے دھونے کی بجائے انتہائی چابکدستی سے اپنے چہرے پر نیا چہرہ لگا کر قہقہہ بردوشوں میں شامل ہو جاتا ہے اور رونا تو صرف اُن ہی کا مقدر ہوتا ہے' جو اصول پسندیوں اور اخلاقی حد بندیوں میں جکڑے ہوئے نہ صرف خود روتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی زندگی کے ہر گام پر رونے کی ترغیب دیتے ہیں۔

مجھے اس بات کا یقین ہے کہ آپ بھی اس وقت اس مضمون کو پڑھتے ہوئے کسی نہ کسی قسم کے رونے میں ضرور مبتلا ہوں گے اگر نہیں' تو کم از کم مجھے ہی کوس رہے ہوں گے کہ میں نے کیسا روتا اور بسورتا ہوا مضمون لکھا ہے۔

☆☆☆

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجیے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

۱۔ http://kitaabghar.com کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔

۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجیے۔

۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

برسات کے بعد

(بارش کے کتنے فوائد ہیں، آپ بھی جان جایئے۔)

تحریر: مرزا عاصی اختر

بزرگوں سے سنتے آتے ہیں کہ ''بارش خدا کی رحمت ہوتی ہے۔'' اس مقولے کی صداقت میں کوئی مبالغہ نہیں مگر بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ رحمت ایزدی مذکورہ مقولے میں ایک نقطے کا اضافہ کر دیتی ہے۔

ایک نقطے نے ہمیں محرم سے مجرم کر دیا

یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ بعض فصلوں کے لیے یہ بارش، آکسیجن کا درجہ رکھتی ہے مگر یہ بھی مستند حقیقت ہے کہ حشرات الارض خاص طور سے مچھروں کے لیے بھی یہ اکسیر کا حکم رکھتی ہے گویا دونوں فصلوں کی پیداوار اسی بارش کا فیضان ہے۔

بارشوں سے گلیاں تو جل تھل ہو ہی جاتی ہیں، سڑکیں بھی سیلابی ہو جاتی ہے۔ پیدل (عقل سے نہیں) چلنے والا بہ امر مجبوری سڑکوں پر چلے گا کیونکہ فٹ پاتھ تو پہلی ہی بارش میں مفقود الخبر ہو جاتا ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ ہر پیدل چلنے والا آنے جانے والے ٹریفک کو بھی راستہ دیتا ہے اور خود بھی زبانی ہارن دے کر پاس کرتا ہے۔ اس موقعے پر شرفا تو اپنی اپنی گاڑیاں آہستگی سے نکال لے جاتے ہیں مگر کچھ بے صبرے ڈرائیور اس تیزی سے چھینٹے اڑاتے ہوئے گزرتے ہیں کہ پیدل چلنے والے منہ اور کپڑے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اب جن حضرات کے کپڑے اس طوفان بدتمیزی سے گندے ہو جاتے ہیں، وہ گھر کی ٹپکنے والی چھت کی مرمت کو بھول کر گاڑی خریدنے کی گہری سوچ بچار میں ڈوب جاتے ہیں تاکہ آئندہ بارشوں کے موسم میں ان خبیث چھینٹے اڑانے والوں سے انتقام لیا جا سکے۔

بارش کے مسئلے پر باپ اور بیٹے کی گفتگو ملاحظہ فرمائیں۔ بیٹا بھیگتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

باپ نے سوال کیا: ''کیوں بیٹے باہر بارش تو نہیں ہو رہی؟''

بیٹا: ''نہیں ڈیڈی بارش بالکل بند ہے۔''

باپ: ''تو پھر تمہارے کپڑے کیوں گیلے ہو رہے ہیں؟''

بیٹا: ''ڈیڈی باہر بارش ہو رہی ہے۔''

انسانی ذہن پر بارش کے اثرات آپ نے ملاحظہ فرمائے اور بیٹے کی سعادت مندی بھی۔ قطع نظر اس کے، اب دو پڑوسیوں کی بات چیت بھی ملاحظہ ہو۔

زید: ''کیوں بھائی، کیا چوراہے سے بھیگتے آ رہے ہو؟''

بکر: ''جی نہیں، میں تو گھر سے ہی بھیگتا ہوا گیا تھا۔''

زید: ''اس بارش کے موسم میں چھتری کے بغیر بازار جانا بھی حماقت سے کم نہیں۔''

بکر: ''اس حماقت میں آپ بھی حصہ دار ہیں۔''

زید: ''وہ کیسے؟''

بکر: ''میری چھتری آپ نے صبح ایک گھنٹے کے لیے منگوائی تھی۔''

زید: ''خیر فالتو باتوں کا وقت نہیں، یہ بتائیں دودھ فروش کی دکان کھلی ہوئی ہے؟''

بکر: ''اس موسم میں تو اس کو پانی فروش کی دکان کہنا چاہیے۔''

زید: ''ارے صاحب اب تو پانی بھی خالص دستیاب نہیں، اس میں بھی پاؤڈر کی ملاوٹ ہے۔''

بکر: (بات کاٹتے ہوئے) ''اور جسے دودھ کے فرضی نام سے فروخت کیا جاتا ہے۔''

زید: (کچھ یاد کرتے ہوئے) ''ہاں میں آپ سے دودھ فروش کی دکان کے بارے میں معلوم کر رہا تھا۔''

بکر: (معذرت کے لہجے میں) ''اوہ، بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، جی دکان کھلی ہوئی ہے۔''

زید: ''دوپہر کے وقت تو بند تھی۔''

بکر: ''درست فرمایا، مگر اس وقت تک کے۔ ایم۔ سی کے بھیجے ہوئے پانی کے ٹینکر نہیں پہنچ سکے تھے۔''

زید: ''شاید اس لیے کہ اس علاقے میں پینے کے پانی کی شدید قلت ہے۔''

بکر: ''جی نہیں، اس دودھ فروش کے ہاں دودھ کی قلت ہے۔''

زید: ''اف میرے خدا، اس گفتگو کا دامن قیامت سے بندھا ہوا لگتا ہے۔ ابھی چوراہے سے دودھ بھی لانا ہے۔''

بکر: ''مگر جناب، آپ تو بھیگ جائیں گے۔''

زید: ''وہ کیسے؟''

بکر: ''صبح جو چھتری آپ نے مجھ سے منگوائی تھی، اسے چھتری کے بجائے چھلنی کہنا زیادہ مناسب ہوگا، کیونکہ وہ قیس کے جگر کی طرح چھلنی چھلنی ہو رہی ہے۔''

زید: ''مگر میرا خیال ہے کہ میں ذرا سا بھی نہیں بھیگوں گا۔''

بکر: (حیرت سے) ''وہ کیسے؟''

زید: ''میں بازار جا ہی کب رہا ہوں؟ دودھ لینے نوکر جائے گا۔''

ذاتی مشاہدہ ہے کہ بارشیں منگنیوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں، جب منگنی پر اس کے اثرات اتنے دور رس ہوں، تو پھر شادی کا تو خدا ہی حافظ

ہے۔ ہمارے جن دوست کا یہ واقعہ ہے ان ہی کی زبانی سنیے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بارشوں کے موسم میں بس اسٹاپ سے گھر تک پہنچنے کا واحد راستہ پانی میں ہو کر گزرتا ہے۔ ایک آدھ گھنٹے میں یہ پانی اس قدر مرتا ہے (آنکھوں کا نہیں) کہ کنارے پر ایک پتلی سی راہداری بن جاتی ہے۔ انسان فطری طور پر سہل پسند واقع ہوا ہے۔ لہٰذا یہ راہداری استعمال کرنا ہی پڑتی ہے۔ ہم چونکہ ذاتی طور پر شریف واقع ہوئے ہیں۔

؎ کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

اس کے ساتھ ساتھ ہماری ہمیشہ کوشش یہ رہتی ہے کہ اپنے بزرگوں کا کہنا مانیں اور نظر نیچی رکھیں۔

؎ کوئی ان سے نہیں کہتا نہ نکلیں یوں عیاں ہو کر

مگر بارش کے اس موسم میں شرافت اور کیچڑ دونوں پر نظر رکھنا پڑتی ہے، مبادا پھسل نہ جائیں' قصہ مختصر یہ کہ بس اسٹاپ پر ہوٹل کے عین سامنے بارش کا پانی پھیلا ہوا تھا مگر کنارے پر مذکورہ بالا راہداری بن گئی تھی۔

وہ موصوفہ ہمارے آگے آگے تھیں..... تھیں تو ہمارے پیچھے مگر ہم نے لیڈیز فرسٹ والے کلیے کے پیش نظر ان کو آگے جانے دیا۔ بس یہی عمل بلکہ حسن عمل ہماری نیکی اور منگنی کو لے ڈوبا۔ کیونکہ راہداری اتنی پتلی تھی کہ ہم ان کے پیچھے پیچھے چلنے پر مجبور تھے۔ ہمارے ممکنہ سسر صاحب اور ان کے رفقائے کار نے یہ دلدوز منظر دیکھا تو تاب نہ لا سکے' دوسرے دن رشتہ کرانے والی صاحبہ سے کہلا بھیجا کہ چونکہ لڑکا بدمعاش ہے اور لڑکیوں کا پیچھا کرتا ہے' لہٰذا یہ رشتہ منظور نہیں۔

بارش کے موسم میں متوسط طبقہ جلدی جلدی گھر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے کہ دیکھیں کمرے کی چھت سے کتنے آبشار بہہ رہے ہیں۔ رہ گئے امراء تو فکر کی کوئی بات نہیں کیونکہ گھر سے نکلے تو کار، دفتر سے نکلے تو کار، اگر خراب ہو گئی تو بے کار، عموماً اس طبقے کے لوگ بارش میں بھیگنے کو ترستے ہیں۔ ایسے ہی ایک صاحب یہ شکوہ کرتے ہوئے پائے گئے کہ ''ہم تو اس امیری سے باز آئے کہ گزشتہ بیس سالوں سے بارش کے پانی کو ترس گئے ہیں۔ ''ان سے عرض کیا کہ'' آپ یہ شوق غسل خانے میں فوارے کے نیچے بیٹھ کر پورا کر سکتے ہیں۔'' بے بسی سے فرمانے لگے۔ ''مگر میں تو کپڑے پہن کر یہ شوق پورا کرنا چاہتا ہوں۔'' خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ اس قبیل کے خواتین و حضرات بارش کے اصل لطف سے محروم ہی رہتے ہیں۔ بیچارے! شاید اسی لیے نظارہ بارش کے لیے ان لوگوں کو گھر سے باہر جانے کا خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے اور جسے ''رینی ڈے انجوائے منٹ'' کا مصنوعی نام دیا جاتا ہے۔

پھر ایسے موسم میں گلی کے نکڑ سے گھر تک پہنچنے کا واحد راستہ اینٹوں کی وہ قطار ہوتی ہے' جسے پل صراط کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ چند دوست اس پل صراط سے ایسے گزر رہے تھے' جیسے سرکس میں ایک صاحب ہاتھ میں بانس کو بیلنس لے کر پتلے سے تار پر چہل قدمی کرتے ہیں۔ پہلے نمبر پر جو صاحب تھے' وہ بار بار سب سے آگے ہونے پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے کہ وہی سب سے پہلے اپنے گھر پہنچیں گے' دوسرے نمبر پر چلنے والے دوست سے نہ رہا گیا' انہوں نے آگے والے دوست کو ہلکا سا ٹھوکا دیا۔ ''اماں چلو یار'' چند ہی ثانیے بعد وہ پہلے نمبر کا اعلان کر رہے تھے' پھر تو ایسی ٹھوکے

بازی چلی کہ آخر میں ایک بڑی بی اول آئیں۔

رفع شر کے لیے عام طور پر پولیس کی مدد لی جاتی ہے مگر آپ یقین کریں کہ شر کو رفع بلکہ دفع کرنے میں یہ اپنی بارش بھی خاصی کارآمد ہے۔ چشم دید واقعہ بیان کرتا ہوں۔ سرکاری نل پر دو اشخاص میں تکرار ہوگئی (دلچسپ بات یہ کہ اس وقت نل میں پانی کی آمد کے دور دور تک امکانات نہ تھے) یہ تکرار مزید دو مرحلوں سے گزرتی ہوئی ہاتھا پائی اور پھر بلوے کی شکل اختیار کر گئی۔

؎ کہیں پانی بھرنے بھرانے پہ جھگڑا

ان تمام اشیاء کا آزادانہ استعمال ہوا' جو قابل دست اندازی پولیس ہوتی ہیں' عید ملن کا یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ بڑے زور کی بارش شروع ہوگئی' پل بھر میں میدان صاف تھا' جیسے ہاتھی کی زنجیر کھل جائے اور وہ بازار میں آ گیا ہو۔ جس کا جدھر منہ اُٹھا سما گیا۔

مضحکہ خیز بات یہ ہوئی کہ اہل شر ایک دوسرے کے ڈنڈے اور ڈبے بھی ساتھ لے گئے' بارش تھمنے کے بعد علاقے کے معززین کی زیر نگرانی ڈنڈوں اور لاٹھیوں کا تبادلہ ہوا تا کہ آئندہ ایسے ہی موقعوں پر دوبارہ استعمال کیے جا سکیں۔

☆☆☆

اردو ادب کے مشہور افسانے

کتاب **اردو ادب کے مشہور افسانے** بھی کتاب گھر پر دستیاب ہے جس میں درج ذیل افسانے شامل ہیں۔ (آخری آدمی، پسماندگان، انتظار حسین)؛ (آپا، ممتاز مفتی)؛ (آنندی، غلام عباس)؛ (اپنے دُکھ مجھے دے دو، وہ بڈھا، راجندر سنگھ بیدی)؛ (بلاؤز، کالی شلوار، سعادت حسن منٹو)؛ (عیدگاہ، کفن، شکوہ شکایت، منشی پریم چند)؛ (گڈریا، اشفاق احمد)؛ (توبہ شکن، بانو قدسیہ)، (گنڈاسا، احمد ندیم قاسمی)؛ (حرام جادی، محمد حسن عسکری)؛ (جینی، شفیق الرحمن)؛ (لحاف، عصمت چغتائی)؛ (لوہے کا کمر بند، رام لعل)؛ (ماں جی، قدرت اللہ شہاب)؛ (مٹی کی مونالیزا، اے۔ حمید)؛ (اوور کوٹ، غلام عباس)؛ (مہالکشمی کا پل، کرشن چندر)؛ (ٹیلی گرام، جوگندر پال)؛ (تیسرا آدمی، شوکت صدیقی) اور (ستاروں سے آگے، قراۃ العین حیدر)۔

یہ کتاب **افسانے** سیکشن میں پڑھی جا سکتی ہے۔

مدہوش مین پوری

تحریر: مرزا عاصی اختر

پورا نام مدہوش مین پوری تھا اور مزاج بھی ایسا تھے۔ بڑی بڑی کٹورہ سی آنکھوں سے سرخ سرخ ڈورے ہر وقت تیرتے رہتے' ہر ملاقاتی یہی سمجھتا کہ ابھی ابھی چڑھا کے بیٹھے بلکہ لیٹے ہیں مگر بہت کم لوگوں کو معلوم تھا۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

یعنی مدہوش صاحب بلند فشار خوں کے دائمی مریض تھے اور اس پر انہیں بہت فخر و ناز بھی تھا کہ بیماری ملی تو پست کے بجائے بلند ہی ملی۔ شاعر ہونے کے ناتے اس پر اتراتے اور اسے کفایت شعاری گردانتے، ان معنوں میں کہ بغیر کچھ پیے آنکھوں کا رنگ شربتی شربتی سا ہو جاتا ہے بقول میر

دل پرخوں کی ایک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

مدہوش صاحب کی ایک اور بیماری، معاف کیجیے گا' ایک اور عادت یہ تھی کہ ہر پانچ منٹ کے بعد ایک پھنکی مین پوری کی بڑی پابندی سے لگاتے تھے اور یہ ان کی زندگی کا جزو لاینفک بن چکی تھی' جس کا یہ فائدہ انہیں پہنچ رہا تھا کہ کھانا کھاتے وقت پورا منہ نہیں کھل پاتا تھا۔ دیکھنے والا یہی سمجھتا تھا کہ کتنی نفاست سے کھا رہے ہیں۔ حبشیوں کی طرح منہ نہیں پھاڑتے' مگر یہ سب کمالات مین پوری کے تھے جو ان کی طعامی نفاست میں اپنا بھرپور کردار ادا کر رہی تھی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ یہ اس سے تنگ بھی تھے اور آئے دن اسے چھوڑنے کی دھمکی بھی بہ آواز بلند دیتے رہتے مگر ہر بار ان کی اہلیہ ہاتھ پیر جوڑتی ہوئی ان کے قدموں میں ڈھیر ہو کر اپنا قصور دریافت کرتیں۔ اب یہ لکھ وضاحتیں کرتے کہ میں آپ کو چھوڑنے کی بات کب کر رہا ہوں مگر وہ مانتی نہ تھیں وہ تو جب یہ ہاتھ پیر جوڑے اور ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر اپنی جان کی قسم کھاتے تب انہیں یقین آتا تھا۔

محلے بھر میں مشہور تھا کہ مرد مار عورت ہے اور یقین اس لیے کرنا پڑتا تھا کہ مدہوش صاحب ان کے چوتھے خاوند تھے۔ متقدمین میں سے دو کو ہارٹ اٹیک ہوا اور ایک نے عروسی ازار بند کا پھندا گلے میں لگا کر خود کو عالم بالا میں پہنچایا تھا۔ مدہوش صاحب متوسطین کی صف میں کھڑے متاخرین کو تکتے کہ دیکھیں ان کا نمبر کب آتا ہے۔ مدہوش صاحب کو دیکھ کر اکثر احباب رشک کرتے کہ قدرت نے اتنی خوبصورت زوجہ سے نوازا ہے مگر جب پچھلوں کا حشر دیکھتے تو ان پر حیرت اور افسوس کے سائے منڈلانے لگتے۔

شعر گوئی کا آغاز چھٹی جماعت سے ہو گیا تھا۔ چنانچہ پہلا دیوان مڈل اور دوسرا میٹرک کے بعد شائع ہو کر اہل ذوق سے داد و تحسین وصول کر چکا تھا خود اپنے اشعار کی تعریف میں ذرا نہیں چوکتے تھے۔ بڑے بڑے شعرا، (متقدین متوسطین اور متاخرین کی قید نہ تھی) ان کے سامنے

پانی بھرتے نظر آتے' بلکہ نلکے پر جمے کھڑے رہتے اور اپنی چار پانچ بالٹیاں بھرنے کے بعد دیگر کا نمبر لگاتے۔ مطلب یہ کہ چار پانچ اپنے شعر پھر کسی نامور شاعر کا ایک آدھا شعر (وہ بھی بھرتی کا) لے کر باہم دست و گریباں کرا دیتے اور آخر میں اپنا شعر وکٹری اسٹینڈ پر کھڑا کر دیتے۔ یہ سارا عمل اتنی سرعت سے کرتے کہ حاضرین ان کا منہ اور شعر دیکھتے رہ جاتے۔

مدہوش صاحب کا فسانہ شادی اب تک یاروں کا یاد تھا۔ مشاعرے میں پہلے ان کی غزل چلتی اور بعد میں منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے یار لوگ انہیں چھیڑ دیا کرتے۔ ایکشن ری پلے کی طرح سلوموشن میں مدہوش صاحب شروع ہو جاتے ان کی زبان غیبت طراز سے سنیے۔ ''میری زندگی کی واحد سہاگ رات، باہر طوفان باد و باراں اور مضافاتی علاقے میں مشاعرہ، بڑا پریشان و حیران، کیا کروں کیا نہ کروں، ایک وقت میں تین طوفان کا مقابلہ کرنا پڑا، کسی ایک سے دامن بچانا مشکل بلکہ ناممکن نظر آ رہا تھا۔ بات وہی تھی کہ!

؎ کھاؤں کہاں کی چوٹ بچاؤں کہاں کی چوٹ

ڈرتے ڈرتے دلہن کا گھونگھٹ اٹھایا اور ایک فلمی شعر سنا کر دست بستہ عرض کیا کہ جس بزم کے تحت یہ مشاعرہ ہے اس میں ایک بھی ناغہ ریکارڈ پر نہیں' براہِ کرم صرف ڈیڑھ گھنٹے کی اجازت مرحمت فرمائیں' موصوفہ نے گردن کو اتنی زور سے جھٹکا دیا جیسے کہہ رہی ہوں کہ ہماری بزم میں تو آپ کا پہلا ہی ناغہ ریکارڈ پر آ گیا۔ مگر میں نے اس کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا البتہ موصوفہ کا شکریہ ادا کیا اور حجلہ عروسی کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے ایک جملہ غیر ارادی طور پر منہ سے نکل گیا ''سومت جانا'' جس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا، ان خواتین اور لڑکیوں کا جو اکثر ایسے موقعوں پر حجلہ عروسی کے اطراف چکر کھاتی رہتی ہیں۔ ہم تو دلہن کو حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن چھوڑ کر ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوا ہوئے اور بجائے ڈیڑھ گھنٹے کے ایک ہی گھنٹے میں واپس حجلہ عروسی پہنچ گئے مگر!

؎ بخت سوئے ہیں بہت جاگے کے اے دورِ زماں

موصوفہ اس وقت خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھیں۔ ہم نے جگانا مناسب نہیں سمجھا اور تازہ اشعار کا ورد کرتے ہوئے خود بھی ایسے سوئے کہ دوسرے دن دلہن کے بھی بہت دیر بعد سو کر اٹھے۔

مدہوش صاحب خوددار بہت تھے۔ میٹرک کے بعد کہیں ملازمت کے لیے انٹرویو دینے گئے سب سے پہلا سوال اس شخص کے بارے میں پوچھا جو بغیر استعفیٰ دیے نوکری چھوڑ کر بھاگ گیا تھا تو جواب ملا کہ ''وہ تو میڈم کے تھپڑ سے سرفراز ہو کر بھاگا ہے۔'' پوچھا ''میڈم کون؟'' جواب ملا ''اس ادارے کی سربراہ'' بوریا بستر سمیٹتے ہوئے بولے، ''اچھا تو اللہ حافظ، بندہ کسی ایسی جگہ ملازمت کرنے کا روادار نہیں جہاں گھر جیسا ماحول ہو۔''

شادی شدگی سے قبل مدہوش صاحب خاصے زندہ دل واقع ہوئے تھے اور اتنے ہی دل پھینک بھی، قدیم فلمی ہیروئنوں کی طرح انہیں وہ تمام کلاسیکل فلمی گانے یاد تھے جو سہگل، پنکج ملک، کے سی ڈے اور دیگر گلوکاروں کی آوازوں میں ہوتے۔ رتن نامی فلم کا اس زمانے میں بڑا شہرہ تھا۔ یہی فلم دیکھ کر ان پر عشق کا بھوت سوار ہوا۔ مذکورہ فلم کے بارے میں مشہور ہے کہ اسے دیکھ کر بہت سی کنواری بالیاں گھروں سے بھاگ کھڑی

ہوئی تھیں۔ مگر مدہوش صاحب اکثر نجی محفلوں میں ہاتھ ملتے ہوئے نہایت افسوسناک جوش سے کہا کرتے تھے کہ ''ہمارے ساتھ تو آج تک کوئی نہیں بھاگا'' اکثر اپنے خاص دوستوں سے ایسی لڑکیوں کے گھروں کے پتے پوچھتے پھرتے جو بھاگ چکی تھیں یا بھاگنے کے لیے پر تول رہی تھیں۔ جب بات نہ بنی تو اس ناکامی کی راکھ سے دکھوں کا مداوا یوں تلاش کیا کہ ایک عدد چابی والا ریکارڈ پلیئر خرید لائے جسے شروع شروع میں تو گھر کے اندر ہی بجاتے تھے مگر اسی دوران شادی کا حادثہ پیش آیا' چند مہینے تو خوب اچھی طرح گزر گئے مگر جب آٹے دال کی ضرورت پڑی تو چودہ طبق روشن ہو گئے اور گھر میں آئے دن کل کل رہنے لگی۔ مدہوش صاحب ریکارڈ پلیئر کو اٹھا کر باہر چوک میں لے گئے یہ کہتے ہوئے کہ ''گھر کے لیے گھریلو ریکارڈ پلیئر ہی کافی ہے۔''

یہ ان کی غریب پروری تھی کہ جملہ اہل محلّہ ذوق موسیقی کو بغیر کچھ لیے دیے جلا بخش رہے تھے' ورنہ آج کل تو کیبل کنکشن بھی تقریباً ہزار روپے میں پڑتا ہے۔ رات کو مدہوش صاحب سارا محلّہ سر پر اُٹھائے رکھتے اور دن میں ان سے اہلیہ کا سلوک ایضاً ہوتا۔ مدہوش صاحب اکثر حیران و پریشان سوچا کرتے کہ آخر یہ خواتین لاؤڈ اسپیکر سے بھی بلند تر آواز کس طرح نکال لیتی ہیں۔ ان کا یہ شوق چند روزہ تھا کیونکہ منتقم حقیقی کو جملہ اہل محلّہ کی نیندوں پر ترس آ ہی گیا جو مدہوش صاحب کافی عرصے خراب بلکہ خراب تر کر رہے تھے۔ زن و شوہر کی اس ازلی لڑائی میں دستور کے مطابق ان کی اہلیہ غالب آئیں اور ریکارڈ پلیئر اونے پونے داموں کباڑیے کے ٹھیلے پر رونق افروز ہوا۔ گھر میں لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا اور ہر لب پر ایک ہی سوال تھا، ریکارڈ پلیئر کیسے بکا؟ مدہوش صاحب ٹکا سا جواب دیتے۔ ''دو کا مقابلہ تھا ایک کو شکست ہو گئی۔''

قدرت کی ستم ظریفی کہ بیوی ان کے لیے ٹی بی کا تحفہ لائی مگر یہ بیماری ان کے ادبی رکھ رکھاؤ میں کوئی تغیر برپا نہ کر سکی۔ چنانچہ اب علم عروض کے مطابق کھانستے تھے۔ ہر کھانسی میں بحر کا پورا خیال رکھتے اس کی وجہ بڑے طمطراق سے یہ بتاتے کہ چونکہ خاندانی شاعر ہوں نیز عیادت کرنے والوں میں زیادہ تر شعراء کرام ہوتے ہیں۔ البتہ غیر شاعر مزاج پرسی کرنے والوں کے سامنے بے بحر کھانسنے کو بدتمیزی نہیں سمجھتے تھے۔ شاعران خوش ذوق ہر باوزن اور موزوں کھانسی کی باقاعدہ داد دیتے۔ جب کہ غیر شاعر حضرات اس موقعے پر سر کھجاتے ہوئے یہ سوچتے رہ جاتے کہ آخر کسی چیز کی داد دی جا رہی ہے۔

حکایت لذیذ بھی ہے اور دراز بھی..... لیکن بہ وجوہ اس شعر پر قصہ تمام کیا جاتا ہے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم میرؔ سے صحبت نہیں رہی

☆☆☆

شکم ہے کہ ستم

وحید الرحمٰن خان

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہمارا پیٹ سینے سے دو قدم آگے تھا۔ توند اگر معمولی سی باہر نکلی ہوئی ہو تو ناظرین کی بصارت اور حس مزاح کو متاثر نہیں کر سکتی، مگر بالشت بھر قد پہ شکم کی گز بھر گیرائی غضب ڈھاتی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہم جہاں سے گزرتے، مختلف القابات سے نوازے جاتے۔ کوئی ہمیں ''تپائی پر رکھا گھڑا'' سمجھتا تو کوئی ''دھرتی پہ بوجھ'' خیال کرتا۔ کئی ایک ہمارے ''شریر'' یعنی بدن کا مفہوم وہ بیان کرتے جو اہل عرب کے نزدیک درست ہے۔ یعنی ''عیب دار'' ہم سنی ان سنی کرتے ہوئے گزر جاتے لیکن لوگ بھینس کے آگے بین بجانے سے باز نہ آتے۔

کہتے ہیں ''لاعلمی نعمت ہے۔'' ایک عرصے تک ہم اس نعمت سے مالا مال رہے۔ کبھی لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرے۔ چھاتی کی طوالت اور پیٹ کی ضخامت کو مردانہ وجاہت کا عملی نمونہ سمجھتے رہے۔ اسی زعم میں ایک حسینہ کا فراداسے اظہار محبت بھی کر ڈالا اور عمر بھر اس کا ہاتھ تھامنے کے لیے دستِ سوال دراز کر دیا۔ اس دلربا نے مسکراتے ہوئے ہوش ربا آنکھوں سے ہمیں سر تا شکم دیکھا اور حیران ہو کر پوچھا:

''کیا تم دونوں مجھ سے محبت کرتے ہو؟''

یہ سن کر پہلی دفعہ احساس ہوا کہ نہ صرف ہماری جسامت بلکہ عقل بھی موٹی ہے۔ بیس سال میں ایک چھوٹی سی بات نہ سمجھ سکے۔

اس سانحے کو گزرے ہفتہ ہوا۔ ندامت اور جسامت کا احساس ہر پل ستاتا رہتا۔ کبھی کبھار تو بڑے خوفناک خیال آتے اور ہر بار ہم اپنا شجرۂ نسب لے کر بیٹھ جاتے یا ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی اجداد کی تصویروں کو بغور دیکھتے لیکن اس سے کبھی یہ ثابت نہ ہوا کہ ہمارے آباؤ اجداد کا تعلق خدانخواستہ ہاتھیوں سے تھا۔

آخر ایک دن ہم سے رہا نہ گیا۔ دوڑے دوڑے اپنے دوست، شیخ صاحب کے ہاں پہنچ گئے، یہاں ایک بات گوش گزار کرتے چلیں کہ شیخ صاحب کے خیال میں ان کے لیے اسم بامسمی ہونے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ زیادہ سے زیادہ شیخی بگھاری جائے چنانچہ وہ زیادہ سے زیادہ ''اسم بامسمی'' ہونے کی کوشش کرتے رہتے ہیں! خود کو خاندانی نواب گردانتے ہیں۔ اپنی کوٹھڑی کو کوٹھی قرار دیتے ہیں اور اپنی پرانی سائیکل کو کسی گورے کی عنایت خاص بتلاتے ہیں، جو ان کے دادا مرحوم کو گوری حکومت سے وفاداری کے صلے میں ملی تھی۔ بہر حال یہ ان کے دادا اور سائیکل کا نجی معاملہ ہے اور شیخ صاحب کے اس دعوے پر احتجاج کا اصل حق سائیکل ہی کو ہے۔

ہم نے شیخ صاحب کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ باہر نکلے، دیکھتے ہی ہم سے ''کمر گیر'' ہوئے بیٹھک میں بٹھایا۔ رسمی حال احوال کے بعد ہم نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

''کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں؟''

''ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں۔'' انہوں نے کہا: ''کیا چاہتے ہو؟''

''ہم اس توند کے ہاتھوں بہت تنگ ہیں۔ بہت کوشش کرتے ہیں کہ کم کھائیں مگر یہ پاپی پیٹ بھرتا ہی نہیں' اب آپ کوئی علاج بتائیے۔ دوا نہ بتائیے گا' ہمیں خدشہ ہے کہ کھانے سے ہم موٹے ہو رہے ہیں' خواہ وہ دوا ہی کیوں نہ ہو!''

وہ گویا ہوئے: ''کھانے پینے سے جسم فربہ نہیں ہوتا' اگر یہ بات ہوتی تو میں تم سے دوگنا ہوتا' ابھی تمہارے آنے سے پہلے دس چانپیں کھا کر بیٹھا ہوں' مگر مجال ہے جو کبھی جسم پر فالتو چربی چڑھی ہو۔''

''مگر آج تو منگل ہے' گوشت کا ناغہ ہے۔'' ہم نے ٹوکا۔

''بھئی' میں مرغ چانپ کی بات کر رہا ہوں۔'' انہوں نے فوراً پینترا بدلا۔ ''تو میں کہہ رہا تھا کہ تناول کی زیادتی سے انسان موٹا نہیں ہوتا بلکہ ورزش نہ کرنے کے سبب جسم کو فالتو بوجھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔''

''آج سے ورزش شروع کر دو' تم بھی میری طرح چھریرے بدن کے مالک ہو جاؤ گے۔''

ہم نے اسی وقت شیخ صاحب کا ''نقد'' شکریہ ادا کیا اور خوشی خوشی رخصت ہوئے۔ دبلا ہونے کا جدید نسخہ سن کر ہم بے حد مسرور تھے' گویا قارون کا خزانہ پا لیا ہو۔ اس لمحے چشم تصور میں ایک رومان پرور نظارہ گھوم گیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہی کافر ادا جس نے ہمارے ننھے منے دل کو بے دردی سے اپنے قدموں تلے روندا تھا' ایک حسین وادی میں موجود ہے اور ہم اس کے پہلو میں بے تکلف بیٹھے' اسی کی زلفوں سے کھیل رہے ہیں۔ اس تصویر خیال میں ہم نہایت سبک اندام نظر آ رہے تھے اور وہ مہ جبیں ہماری اچانک ''کوتاہ شکمی'' پر حیرت زدہ تھی۔ پھر وہ یکا یک ہمارے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نیم کلاسیکل انداز میں گنگنا اٹھی ہے۔

تماشائے اہل ''شکم'' دیکھتے ہیں
شکم آپ کا آج ''کم'' دیکھتے ہیں

''امی یہ تو آپ سے بھی موٹا ہے۔''

اچانک کسی بدتمیز بچے کی آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔

اور ہمارے حسین تصور کا شیش محل دھڑام سے چکنا چور ہو گیا۔ ہم نے قہر آلود نظروں سے اس راست گو بچے کی جانب دیکھا' جو اپنی ''وسیع و عریض'' والدہ محترمہ کے اور ہمارے تن و توش کا سر بازار موازنہ کر رہا تھا' بہر کیف ہم نے دبلا ہونے کا جدید نسخہ پانے کی خوشی میں اس بچے کی بدتمیزی سے چشم پوشی فرمائی اور کتابوں کی ایک دکان کے دروازے کے دونوں پٹ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد ہمیں ورزش کے موضوع پر ایک مفید کتاب مل گئی' جس کے مرتب کا دعویٰ تھا کہ اس کتاب کی تمام ورزشیں آزمودہ ہیں۔

کتاب میں کہا گیا تھا کہ ورزشیں آزمودہ ہیں۔ صبح کا وقت ورزش کے لیے موزوں ہے۔ ادھر ہمیں صبح سویرے اٹھنے کا اتفاق برسوں

سے نہیں ہوا تھا' حتیٰ کہ اب تو یہ بات یادداشت سے تقریباً محو ہو چکی تھی کہ صبح کا وقت ہوتا کیسا ہے! خیر' ہم نے الارم والی گھڑی کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ بہت ڈھونڈنے پر ایک عمر رسیدہ گھڑی ہاتھ لگی۔ ہم نے اسی کو غنیمت جان کر اس کے کان مروڑے اور اسے سرہانے رکھ کر سو گئے۔

ابھی ہماری آنکھ لگی ہی تھی کہ کمرے میں کہرام مچ گیا۔ یوں لگا جیسے جنگ کا نقارہ بج رہا ہو۔ شور سن کر ہم تو کیا' ہمسائے کا مرغا بھی جاگ اُٹھا اور بانگ پر بانگ دینے لگا۔ ہم بجلی کی سی تیزی سے اُٹھے، بستر سے کودے، منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور ورزش کے لیے تیار ہو گئے۔

جوگنگ کی غرض سے سبزہ زار کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ راستے میں کئی کتے ہم پر غرائے' کچھ باقاعدہ بھونکے لیکن ہم اپنی دھن میں دوڑتے رہے' کیونکہ ہم جانتے تھے کہ ''بھونکنے والے کتے کاٹا نہیں کرتے۔'' مگر شاید کتے یہ بات نہیں جانتے تھے' چنانچہ بیک وقت کئی کتوں نے ہمارا باقاعدہ تعاقب شروع کر دیا۔ یہ لشکر سگاں دیکھ کر پسینے چھوٹ گئے۔ حفظ ماتقدم کے تحت اپنی رفتار میں اضافہ کیا۔ نتیجتاً کتے پیچھے رہ گئے اور ہم اس دوڑ میں اول قرار پائے۔ اپنی خوش خرامی اور کتوں کی کم کوشی پر خدا کا شکر بجالائے۔

میدان میں داخل ہوئے' تو ہماری حالت دیدنی تھی۔ سانس یوں چل رہی تھی' جیسے دھونکنی دھونکی جا رہی ہو۔ سینے میں دل کنویں کے مینڈک کی طرح اچھل رہا تھا۔ کچھ دیر تو ہمیں اپنا ہوش بھی نہ رہا۔ ذرا سنبھلے تو ورزش کی ٹھانی۔ پہلے پہل کمر کی ورزش کے لیے کمر ہمت باندھی' کیونکہ ہمارے نزدیک کمر وہ مقام ہے' جو پیٹ اور سینے کی حدود کا تعین کرتا ہے اور دبلا ہونے کے لیے کمر کا ''محبوب کی کمر'' کی طرح باریک ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ پیٹ کے آس پاس کمر ٹٹولنے لگے مگر یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ شکم اور سینے کے درمیان ایسی کوئی حد بندی نظر نہ آئی۔ اتنا ہم جانتے تھے کہ کمر پسلیوں سے ذرا نیچے واقع ہوتی ہے۔ چنانچہ پسلیوں سے زیریں علاقے کو کمر مانتے ہوئے ہاتھ دھر دیا اور اچھل کود شروع کر دی۔

اس قدر وزنی توند کے ساتھ ہماری یوں اچھل کود سے ''رن'' ایک طرف ''چرغ کہن'' بھی کانپ اُٹھا۔ کافی دیر بعد ہمیں اپنی زیادتی کا احساس ہوا چنانچہ کمر سے ''ہاتھ اُٹھا لیے۔'' اور کتاب میں موجود ورزشوں کی تراکیب کے بارے میں سوچنے لگے۔ یاد آیا کہ ڈنڈ پیلنے سے بہتر کوئی ورزش نہیں۔ چنانچہ ڈنڈ پیلنے کے لیے جھکے۔ ہم جھک تو بآسانی گئے مگر اُٹھنا' اس جہاں سے اُٹھنے کی مانند محسوس ہوا۔

غرض' صبح سویرے ورزش ہمارا معمول بن گیا۔ کوئی ایک ہفتے بعد خیال آیا کہ کیوں نہ اپنا وزن کرایا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ وزن میں کتنی کمی واقع ہوئی ہے۔ اب جو وزن کرنے والی مشین پر کھڑے ہوئے تو دل بیٹھ گیا۔ مشین کی سوئی تیزی سے گھومی اور وہاں جا کر رک گئی' جہاں ایک ہفتہ قبل تھی۔ وزن نہ تو لاکم ہوا نہ ماشا زیادہ۔ گویا اتنی بھاگ دوڑ اور ''اونچ نیچ'' ہماری توند کے حدود اربعہ میں کوئی تبدیلی نہ لا سکی۔

ہم بوجھل قدموں' واپس چلے آ رہے تھے کہ راستے میں اپنے ایک ہمسائے مرزا صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ تشویش ناک لہجے میں پوچھنے لگے:

''کن سوچوں میں گم ہو' صاحبزادے؟''

ہم نے ساری رام کہانی سنا دی' بولے: ''تم تو یونہی زندگی کی فکر میں دبلے ہو رہے ہو۔ میں تمہیں دبلا ہونے کا ایک تیر بہدف نسخہ بتاتا

ہوں۔ اگر ایک ہفتے میں تمہارا وزن نصف نہ ہو جائے تو جو چور کی سزا وہ میری۔ ''

ہم نے تڑپ کر استفسار کیا: ''آپ کو ہماری توند کی قسم' جلدی بتایئے۔ ''

وہ گویا ہوئے: ''برخوردار! اگر وزن کم کرنا ہے' تو خوراک کم کرو۔ ورزش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر ڈائٹنگ نہ کی تو' تا حشر یونہی موٹے رہو گے۔ ''

یہ نسخہ سن کر ہم پھولے نہ سمائے۔ سوچا کل سے ڈائٹنگ کیا کریں گے۔ اگلی صبح نہا دھو کر تیار ہوئے اور دسترخوان کے پاس سج کر بیٹھ گئے۔ ابھی منہ میں پہلا ہی لقمہ ڈالا تھا کہ یاد آیا کہ آج سے ڈائٹنگ کا آغاز کرنا ہے۔ ناشتے کا سامان دیکھ کر جی بہت للچایا لیکن ہم نے فارسی مثل کے مطابق بلی کو پہلے دن ہی مارنے کا فیصلہ کیا اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ تمام گھر والے حیرت زدہ رہ گئے اور کھانے سے اجتناب کی وجہ کے بارے میں کریدنے لگے۔ ہم نے اصل بات بتائی' تو سب کے سب افراد طنزیہ انداز میں کھلکھلا اُٹھے۔

لیکن ہم ذرا بھی دل برداشتہ نہ ہوئے۔ ہم نے ''شکم برداشتہ'' ہونے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ہم خالی پیٹ ہی کالج روانہ ہو گئے۔

کالج میں خالی شکم نے بڑے تقاضے کیے۔ یار دوستوں کو فرصت کے اوقات میں ہماری توند پر ہاتھ مارنے کی عادت تھی' آج انہوں نے یہی روایت دہرائی' تو سب کے ساتھ ہم بھی حیران ہوئے کیونکہ توند پر ہاتھ مارنے سے آج ایک بالکل مختلف اور تیز آواز بلند ہو رہی تھی' ذرا غور کرنے پر عقدہ کھلا کہ

جو ظرف بھی خالی ہے صدا دیتا ہے۔

شام ہوئی تو بھوک اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ یوں لگا جیسے پیٹ میں چوہے نہیں ہاتھی دوڑ رہے ہوں۔ لیکن صبر کیا۔ رات ہوئی تو سب اپنے اپنے کمروں میں جا کر سوئے۔ مگر ہمیں بھوک کے مارے نیند نہیں آ رہی تھی۔ یکا یک ذہن میں ایک عجیب بات آئی۔

''یوں فاقہ کشی صریحاً خودکشی کے مترادف ہے۔ پاگل نہ بنو اور کچھ کھا پی لو۔''

''لیکن اگر کھانا پینا شروع کر دیا' تو گھر والے مذاق اُڑائیں گے اور دبلے بھی نہ ہو سکیں گے۔'' ضمیر کے ایک کونے سے آواز آئی اور یوں ضمیر اور پیٹ کی جنگ چھڑ گئی۔ کبھی ضمیر کا پلڑا بھاری ہوتا' تو کبھی پیٹ کا۔ آخر پیٹ اور ضمیر کی جنگ میں جیت' پیٹ کی ہوئی۔

ہم نے دبے پاؤں باورچی خانے کا رخ کیا اور کھانے پر پل پڑے۔ ابھی کھانا کھا ہی رہے تھے کہ یکا یک کئی زوردار قہقہے بیک وقت بلند ہوئے۔ ہڑبڑا کر اِدھر اُدھر دیکھا' تو تمام گھر والوں کو اپنے اردگرد موجود پایا۔ وہ ہماری شکم پروری کی داد قہقہے لگا کر دے رہے تھے۔ اس لمحے ہم نے اردو محاورے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سر کے بجائے پَیٹ، پیٹ لیا۔

گھر والے البتہ تالیاں پیٹ رہے تھے۔

☆☆☆

منگل اشٹکا

راجندر سنگھ بیدی

بارہ کا رتک۔۔۔۔تلسی بیاہ کا تہوار تھا۔اُسی دن نندہ اور وجے کا بیاہ ہوا۔نندہ کے چہرے کی سپیدی اور سُرخی کسی رنگریز کے ناتجربہ کار شاگرد کے سُرخ رنگے ہوئے کپڑے کے مانند تھی۔اور وہ کسی مستور جذبے سے سرتاپا کانپ رہی تھی۔اگر اس خود فراموشی میں صرف اُسے اتنا سا خیال رہتا کہ وہ کہاں کھڑی ہے اور ایسی حالت میں اُسے کیا کرنا چاہیے۔تو وہ آنکھیں جھپکے بغیر ایک مسلسل نظر سے جیوارام پروہت کی آٹے سے کھینچی ہوئی لکیروں یا خوبصورت وجے کے گورے گورے پاؤں کی طرف نہ دیکھتی اور نہ وہ پھیریاں لیتے ہوئے قدرے سیدھی کھڑی ہو جاتی۔کیوں کہ قد میں وہ کچھ لمبی تھی اور سیدھی کھڑی ہونے سے وہ اپنے شوہر کے شانے سے بھی سر نکالتی تھی۔بیاہ سے چند روز پہلے اُس کی ماں نے اُسے پھیرے کے موقع پر جھک کر چلنے کی سخت تاکید کی تھی۔مگر نندہ تو یہ بھی بھول چکی تھی کہ بیاہ کے وقت اور بیاہ کے بعد جسمانی لحاظ سے ہی نہیں بلکہ ہر لحاظ سے اُسے اپنے شوہر سے نیچے ہو کر رہنا پڑے گا۔

وجے کی حرکات بہت حد تک اُس کی دلی کیفیت کی ترجمان تھیں اس کی بے تاب امنگیں آنکھوں کے راستے سے نہایت آوارگی کے ساتھ پل پل کر نندہ کی گوری گوری کلائیوں اور جسم سے جس کا چھریرا پن سات پردوں میں ملبوس ہونے پر بھی دکھائی دے رہا تھا بے محابا لپٹ رہی تھیں۔کبھی کبھی وجے کسی گہرے خیال کے زیر اثر آنکھیں بند کر لیتا۔جیسے مستقبل کی تمام مسرّتیں سمٹ کر اس موجودہ لمحے میں مرکوز ہو رہی ہوں۔اور جیوا رام پروہت ان تمام جذبات کو بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پنڈت جیوارام کے سامنے آج یہ تیسرا جوڑا تھا۔جسے وہ رشتہ ازدواج میں منسلک کر رہا تھا۔جیوارام نے بیاہ کا ساتواں منتر پڑھا۔منتر پڑھتے وقت اُسے اپنے دماغ کو استعمال کرنے کی ضرورت کم ہی محسوس ہوتی تھی۔کیوں کہ بچپن ہی میں جب رَوی شنکر چٹوپادھیائے نے اُسے منتر پڑھائے تو اس نے سب کچھ صحیح طور پر ایسارٹ لیا تھا کہ تلفظ درست کرنے، لہجہ سلجھانے، آواز کو اونچا نیچا کرنے اور سُر بدلنے کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔یوں بھی یہ فن اُسے ورثے میں ملا تھا۔وہ ایک خود بہ خود حرکت کرنے والی مشین کے مانند باقاعدہ طور پر اور معیّن جگہ پر۔یعنی منگل، سنیچر، گنیش سے منسوب خشک آٹے کے خانوں میں پیسے رکھواتا۔یا سیندور اور چاول پھینکواتا اور ایسا کرنے میں اُس سے بھول چوک کبھی نہ ہوتی۔

جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ایسی صحت سے وہ تمام ضروری رسوم سرانجام دیتے ہوئے تخیل میں کہیں پہنچ جاتا۔اُس دن وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ایک اُونچی پہاڑی پر کھڑا ہے۔پہاڑی کے دامن میں اُس کو ایک خوبصورت جھیل، اس میں تیرتے ہوئے بجرے، اُس کے کنارے پر لہلہاتی ہوئی کھیتیاں اور ساتھ ہی ماہی گیروں اور دہقانوں کے وہ جھونپڑے نظر آ رہے تھے جن میں لوگ ایسی مسرّت سے سرشار تھے جس پر بادشاہوں کو بھی رشک آئے اور اس سے پرے امراء کے محل جن میں وہ اپنے زر و دولت اور شان و شوکت کے باوجود غریبوں سے بھی زیادہ دکھی تھے۔جھیل کے مشرقی کناروں پر پانی میں ناگ پھنی اور کنول اُگ رہے تھے اور شیشم کے ایک کمزور سے درخت کے نیچے کوئی تارک الدنیا، سنیاسی ترئی پھونک رہا تھا اور

ترئی کی دل کش آواز اُس بات کی یاد دلا رہی تھی۔ جسے نسلِ انسان ازل سے بھولتی چلی آ رہی ہے.....اور پھر جیوارام نے ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لی۔ اب اُس نے دل میں کہا۔ ''ان ہاتھوں سے سینکڑوں بیاہ رچے۔ ان ہاتھوں نے سینکڑوں گھر آباد کیے، کئی غمزدوں کا ایک ایک لمحہ انبساط و نشاط میں سمو دیا۔ مگر میں خود ویسے کا ویسا کنوارا، خانہ برباد اور تنہائی کی ختم نہ ہونے والی مصیبت میں گرفتار رہا۔ اس ناگ پھنی اور کنول کے مانند جو پانی میں اُگتے ہیں۔ مگر پانی سے آلودہ نہیں ہوتے۔

اچانک اُسے خیال آیا کہ وہ بیاہ آخری منتر، منگل اشٹکا پڑھ رہا ہے اور پھر اشٹکا کا بھی آخری لفظ۔

''ساودھان۔'' اُس نے خود کو کہتے ہوئے پایا۔

ساودھان کے لفظ کے ساتھ ہی بیاہ مکمل ہو جاتا ہے۔ چناں چہ ہر طرف سے مبارک باد کی آوازیں آنے لگیں اور اس شور و غوغا نے جیوا رام کی توجہ کو اپنی طرف مائل کر لیا۔

''ساودھان'' جیوارام نے ایک دفعہ پھر کہا اور.....تیسرا بیاہ پڑھنے کے بعد جیوارام پنڈت کچھ تھکن سی محسوس کرنے لگا۔ آمدنی کا لالچ اُسے اتنی محنت پر کم ہی مجبور کیا کرتا تھا۔ جیوارام نے اپنی بوجھل آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ آنکھوں کے نیچے بھاری بھاری تھیلے زیادہ بھاری اور سیاہ دکھائی دینے لگے۔ تھیلوں کو سکیڑ کر جیوارام نے ایک جمائی لی۔ نندہ کو منہ بسورتے دیکھا کیوں کہ وہ اپنے ماں باپ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہی تھی اور وجے کو مسکراتے ہوئے کیوں کہ عنقریب وہ شادی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے والا تھا۔ کئی جمائیوں کے درمیان پروہت نے نہایت اختصار سے نندہ اور وجے کو خاوند اور بیوی کے جُداگانہ فرائض سے آشنا کیا۔ اُس کی تقریر کا لُبِ لباب یہ تھا کہ وہ آگ، پانی، ہَوا، زمین اور آسمان کی گواہی میں ایک کیے جاتے ہیں۔ نندہ کو بتایا گیا کہ وہ ہر لحاظ سے شوہر سے کم رتبہ رکھتی ہے (اگرچہ جسمانی لحاظ سے وہ شوہر سے سر نکالتی ہے....) وجے سے کہا گیا کہ اُسے چاہیے کہ وہ نندہ کو اپنے گھر کی رانی بنا کر رکھے۔ پھر جیوارام نے وجے کو خاص طور پر برہمن، استری اور گائے کی حفاظت کرنے کی تلقین کی۔ شوراتری کی کتھا کا ایک حِصّہ سناتے ہوئے جیوارام نے کہا۔

.....وجے تم بھی پنڈت ہو۔ تم خود جانتے ہو گے۔ شکاری جو تیر مارنا چاہتا تھا۔ اسے جانوروں نے اپ دیش دیا

۱۰ بکریوں کا مارنا برابر ہے ایک بیل مارنے کے

۱۰۰ آدمیوں کا مارنا برابر ہے ایک براہمن مارنے کے

۱۰۰ براہمنوں کا مارنا برابر ہے ایک استری مارنے کے

۱۰۰ استریوں کا مارنا برابر ہے ایک گربھوتی (حاملہ) استری مارنے کے

۱۰۰ گربھوتی استریوں کا مارنا برابر ہے ایک گائے مارنے کے.....

اپنا کام نمٹا چکنے کے بعد جیوارام نے وہاں سے جانا چاہا۔ کس لیے؟ تنہائی کی مصیبت میں پھر گرفتار ہونے کے لیے، ویسا ہی برباد، کنوارا اور اچھوتا رہنے کے لیے جیسے سخت بارش کے بعد ناگ پھنی اور کنول بن بھیگے سر اُٹھائیں۔ اتنے بیاہ اس کے ہاتھ سے ہوئے۔ شادیوں کی اس موسلا

دھار بارش میں بھی وہ ناگ پھنی کے مانند۔ اس وقت جیوارام کے تصوّر میں نندہ کا نہ بھول سکنے والا چہرہ وجے کی اوباش و آوارہ نگاہیں اور کانوں میں براتیوں کا شور و غوغا اور گانے اور ہنسی مذاق کی آوازیں تھیں۔ اس کی جذباتی طبیعت درحقیقت اُسے وہاں سے رخصت ہو جانے پر مجبور کر رہی تھی۔

وہ طبیعت کیسی تھی..... بات یہ تھی کہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہونے کی وجہ سے وہ باجے ڈھولک، گانے، مذاق اور چٹکیوں کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ بیاہ کے موقع پر دلھن کے چہرے کا حیا سے رنگ بدلنا، نوشہ کی دزدیدہ نگاہیں، رخصت ہوتے وقت دلھن کا رونا، راگ رنگ، ہنسی اور مذاق اور قہقہے اس کے دل میں ایک ہیجان بپا کر دیتے۔ خصوصاً بیاہ کے گیت سن کر تو اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگ جاتا۔ اور اپنے شدید کنوارے پن میں اُسے یہ محسوس ہونے لگ جاتا کہ وہ اس تمام شور و غوغا میں ایک ادنیٰ، بے توقیر اور فالتو سی شخصیت ہے، اُس کا یہ وہم دیوانگی کی حد تک پہنچ چکا تھا منگل اشٹکا پڑھنے اور ساودھان کہہ چکنے کے بعد وہ فوراً ایک کونے کی طرف سرکنا شروع کر دیتا۔ جس قدر دلھن والے اور براتی اُس کی فوری کنارہ کشی دیکھتے، اُسی قدر اُسے بیٹھنے کے لیے مجبور کرتے۔ نہایت تکریم سے بلاتے مگر جتنا کوئی اصرار کرتا۔ جیوارام کو اتنی زیادہ خفت ہوتی۔

ایک اور بات سے بھی اس کا اس قدر شرمیلا ہونا منسوب کیا جا سکتا تھا شروع سال میں باتوں باتوں میں جیوارام نے مجھے بتایا کہ اُس سال چیت کی پورن ماشی کو ہنومان جینتی کے دن وہ چالیسویں سال میں قدم رکھے گا۔ یکا یک مجھے خیال آیا کہ چیت کی پورن ماشی کے دن ماروتی دیو یعنی ہنومان جی پیدا ہوئے تھے اور اُس دن سے چالیس برس پہلے جیوارام کی پیدائش بھی انھیں ستاروں کے زیر اثر ہوئی ہوگی جس کے باعث اس کا جسم بھی تنومند تھا اور طبیعت میں ہنومان جی کی سی بے چینی اور جوش تھا یعنی وہ ایک جگہ جم کر کم ہی بیٹھ سکتے تھے۔ فقط ایک بات تھی جو ہنومان جی میں نہ تھی اور وہ جیوارام میں تھی اور وہ جیوارام کا شرمیلا پن اور غیر ضروری حجاب تھا۔ ہوسکتا ہے کہ ہنومان جی کی پیدائش اور پنڈت جیوارام کی پیدائش میں کچھ وقت کا فرق پڑ گیا ہو اور جیوارام دوسری راس میں داخل ہو کر ہنومان جی سے تفریق پیدا کر چکا ہو اور کسی کمزور ستارے نے ہنومان جی کی سی بے باکی اور جرأت کو شرمیلے پن اور محجوبی میں بدل دیا ہو۔ بہ ہر حال وہ اس وجہ سے بھی شرمیلا تھا کہ برسوں سے اکیلا رہتا آیا تھا۔ عمر کے چالیسویں سال میں قدم رکھتے ہوئے وہ اس خوف ناک حد تک کنوارا تھا کہ اگر بیمار پڑ جائے تو کوئی اسے پانی کو بھی نہ پوچھے چونکہ عورتوں کی بابت وہ کچھ نہیں جانتا تھا اس لیے ان سے ڈرتا تھا۔ وہ فقط یہ جانتا تھا کہ دنیا میں بہت سے جھگڑوں کی ابتدا عورت سے ہوا کرتی ہے۔ اس بات کا بھی اسے علم تھا کہ عورت کی طبیعت (اس کی اپنی طبیعت کے مانند) جذباتی ہوتی ہے۔ مبہم اور شرمیلی، نامعلوم کس وقت کوئی بات اسے بُری معلوم ہونے لگے۔ حال آں کہ اس میں ذرّہ برابر شک نہیں کہ جیوارام بُری بات کے معیار سے ناواقف تھا۔ بیسیوں بار اس نے جی کڑا کر کے ایسی باتیں کی تھیں جو اس نے پہلے دل میں بُری محسوس کی تھیں۔ مگر کسی عورت نے بُرا نہ مانا اور اب تو اس کی ہمّت بڑھتی جاتی تھی۔ بیس برس سے چالیس برس کی عمر کے درمیان اسے خیال آیا کہ وہ برہمچاریہ آشرم سے گرہست آشرم میں داخل ہو جائے۔ مگر برہمچاری پنڈت کا درجہ سماج میں کتنا اونچا ہوتا ہے، اس کا اسے غرور تھا۔ محض انگشت نمائی کے خوف سے اس نے اپنے آپ کو روکے رکھا تھا حتیٰ کہ چالیس برس کی عمر کو پہنچنے تک یہ خیال بہت شکستہ ہو گیا تھا۔ کئی تخیّل انگیز بیاہوں نے اس کی ہٹ پر کاری ضرب لگائی تھی اور رفتہ رفتہ یہ اس کے ذہن نشیں ہو گیا کہ چلتی پھرتی دنیا میں کسی کو اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ وہ اپنا کام کاج چھوڑ چھاڑ کر انگشت نمائی کے لیے وقت نکال سکے۔ ایسا خیال کرنا تو اپنے ہی من کی مایا ہے۔ گرہست کے قضیوں کا رونا اگرچہ رُلنا شہر کے متعدد گرہستیوں سے

انفرادی طور پر سنتے سنتے اس کے کان پک چکے تھے پھر بھی کسی ہوش رُبا بیاہ کے اختتام پر چند لمحے حیرت میں ڈوبے رہنے کے بعد جیوارام منہ سے انگلی نکال کر سر کو ایک جھٹکا دیتا جیسے کسی وکیل کو اپنے مؤکل کے بیان میں کوئی ایسا موافق نکتہ دکھائی دے جس پر تمام مقدمہ گھوم جائے۔ وہ مشکوک انداز سے کہتا، ''یہاں.... یہ بات بھئی! آخر کچھ تو ہے جو رونے پیٹنے کے باوجود لوگ خوش رہتے ہیں۔ اس کش مکش اور بے قراری میں بھی کچھ لطف ضرور ہے مگر جب جیوارام کے کان میں یہ الفاظ پڑتے کہ جیوارام چالیس برس کا ہو چکا ہے اور اس نے ابھی استری کا منہ تک نہیں دیکھا تو جیوارام کو اپنی فوقیت اور عظمت میں شک نہ رہتا۔ ایسی بات سُن کر جیوارام کے خوش آئند تخیل کی بنائی ہوئی بیاہ کی حسین عمارت ملبہ سمیت نیچے آ رہتی اور اسے از سرِ نو اور زیادہ وسیع اور شان دار بنانے کے لیے ایک ہوش رُبا بیاہ، اس کی تمام رونق، ازدواجی رشتوں میں منسلک ہونے والے لڑکے اور لڑکی کی غائبانہ کشش، ان کے والدین کی خوشی، اسی راگ رنگ، اور ہنگامۂ ہاؤ ہُو کی ضرورت ہوتی، اور نندہ اور وجے کا بیاہ پڑھ چکنے کے بعد ایک ایسی تعمیر کے کنگرے جیوارام کے تخیل میں آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔

چند دنوں کے بعد اوباش وجے جو رُلنا ہی میں رہتا تھا۔ اور دور نزدیک سے جیوارام کا رشتے دار بھی تھا، آیا۔ اس کی آنکھوں کے سرخ ڈورے زیادہ پھول رہے تھے اور ان سے شعلے نکلتے دکھائی دیتے تھے جیسے اس کے اندر کوئی بھٹی جل رہی ہو۔ ہاں! شباب کی بھٹی تھی نا وہ ؎

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام

وجے نے کنوئیں کی چرخی کا سہارا لیتے ہوئے جیوارام سے کہا، ''کہو دادا (بھائی) اتنے اداس کیوں ہو؟''۔

جیوارام نے اپنی افسردگی کو چھپا لیا اور بولا، ''بھئی کل سے بیمار ہوں، بہت لاچار ہوں، بھائی کو خط لکھا ہے، بھاوج کو یہاں بھیج دے، مجھے تو یہاں پانی دینے والا بھی کوئی نہیں۔''

''ارے بھاوج؟ ایک ہی کہی تم نے۔ دھانوں کے دن ہیں۔ آجکل چھٹائی میں سر دھنتی ہوگی۔ جیٹھو کی کمائی انھیں تک محدود ہے۔ اور آجکل تو بھاؤ پھلانگتا ہوا اوپر جا رہا ہے۔ ایک پانی برس گیا تو ان کے کوڑی دام نہیں۔''

دور سے نیل رتن آتا دکھائی دیا۔ نیل رتن مجسم شیطان تھا۔ وہ ہمیشہ بے وجہ ہنستا تھا۔ بے موقع ہنسی مذاق کیا کرتا۔ جب لوگ ہنستے تو وہ روتا، جب لوگ روتے تو وہ ہنستا۔ یہ تعریف اولیاء کی ہوتی ہے۔ مگر وہ ولی بھی تو نہ تھا۔ اور یہی بات خطرناک تھی۔ نیل رتن سے ذکر کیا گیا تو وہ بولا، ''ٹھیک ہے بھاوج کو غرض پڑی ہے کہ تمھارے یہاں آئے۔ اس کے تین بچے ہیں، تینوں کم سن، تینوں لڑکیاں جن کا تن ڈھانپتے ہی آدھا دن گزر جاتا ہے۔ بھلا آئے تو ایک ایک کٹوری سے کم دودھ..... کسی کو کیا دو گے..... کیا کہتے ہو سیر؟''..... ایں؟''

''مَیں کہتا ہوں دو اڑھائی سیر سے کم نہ لگے گا۔ ذرا حساب تو لگاؤ..... اور پھر کئی قسم کا خرچ آپڑے گا۔ یوں دبو گے جیسے چوہلی کے نیچے دبا ہوتا ہے۔''

پھر اس بات کا رخ خود بہ خود پلٹ گیا۔ نیل رتن بولا، ''کیوں وجے! بیاہ کیسا رہا، بیوی تو اچھی ہے ناں؟''۔

جیوارام نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''بھئی نندہ تو یوں بھی دیوی ہے۔ نری دیوی، وہ جہاں بھی جاتی گھر سوَرگ بنا دیتی۔''

''ٹھیک کہتے ہو دادا۔'' وجے نے کنوئیں کی چرخی کا سہارا ہٹاتے ہوئے کہا، ''گرہست تو سچ مچ سورگ ہوتا ہے..... کیا بتاؤں؟ نندہ تو سچ مچ نندہ ہی ہے..... مَیں نے پچھلے جنم میں کوئی کرم کیے ہوں گے، جو مجھے نندہ ملی..... ایشور کرے میرے ایسا سکھ ہر ایک کو نصیب ہو۔''

اس کے بعد وجے نے اپنے آپ بتایا کہ نندہ اس وقت تک کھانا نہیں کھاتی، جب تک اسے نہ کھلا لے۔ وہ کہیں باہر چلا جائے تو تمام دن انتظار ہوا کرتا ہے..... دیر لگا کر آئے تو اسے روتا ہوا پاتا ہے۔ شکوے ہوتے ہیں۔ رات کو سونے سے پہلے اس کے پاؤں دباتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

شاید یہ خوش ہونے کی بات تھی اسی لیے نیل رتن نے افسردہ سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''ایسا ہی ہوتا ہے بیٹا جی۔ چند روز۔ ذرا ایک دو برس گزرنے دو..... ایک آدھ بچہ ہو جائے گا پھر دیکھنا یہ گرہست کس بھاؤ پڑتا ہے..... کدھر جاتے ہیں وہ چونچلے۔''

''خیر کچھ بھی ہو،'' جیوارام نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''جس گھر میں نندہ سی بیوی چلی جائے..... وہ گھر تو.....''

پھر نا معلوم جیوارام کو کیا ہوا، فوراً ہی مغموم سا منہ بناتے ہوئے بولا، ''وہ زندگی ہماری طرح تو نہیں کہ بیمار پڑ گئے تو کوئی پانی کو بھی نہ پوچھے۔ بھاوج کو لکھیں تو وہ دھانوں یا بچوں کی وجہ سے نہ آئے۔ اگر آئے تو دو اڑھائی سیر دودھ وغیرہ، یہی اندازہ تھا نا رتن؟''

وجے اور نیل رتن نے شدید طور پر جیوارام پنڈت کی مصیبت کو محسوس کیا۔ نیل رتن نے ایک خاص انداز سے وجے کی طرف دیکھا۔ وجے بولا، ''دادا تم جانتے ہو مَیں کس لیے تمھارے پاس آیا ہوں؟''

''نہیں، مَیں کیا جانوں''

''مَیں تم سے 'منگل اشٹکا' سیکھنے آیا ہوں، باقی کے سات منتر تو مجھے آتے ہیں۔ 'منگل اشٹکا' پڑھتے وقت کچھ روانی نہیں پاتا ہوں۔''

''تم بھی پروہتوں کا کام کرنے لگے..... اپنا کام چھوڑ دیا تم نے؟''

''تمھیں سکھا دینے میں تامل ہی کیا ہے۔ ایک خاص بیاہ پر ضرورت ہے.....'' پھر جیوارام کے قریب آتے ہوئے وجے نے کہا۔

''دادا! بات یہ ہے۔ ہمارے ہاتھ تلے ایک لڑکی ہے..... نہایت سندر، ذرا چنچل ہے..... تمھاری طرح، عورتیں ہوتی ہی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں۔ تمھارا اُس سے بیاہ ہو جائے۔ بیاہ مَیں ہی پڑھ دوں اور زیادہ لاگ لپٹ اور شور نہ ہو..... گرہست میں تمھیں بہت سکھ ملے گا۔ تمھاری حالت کا اندازہ مَیں نے اُسی دن لگا لیا تھا۔ جب تم میرا بیاہ پڑھ رہے تھے۔''

وجے اور نیل رتن جیوارام کے اثبات و نفی کا انتظار کرنے لگے۔

چند لمحات کے لیے خاموشی رہی۔

جیوارام کا جواب خاموشی تھا۔ جس کا مطلب تھا نیم رضامندی۔

نیل رتن نے چپکے سے کہا۔ ''دادا، اچھی بات ہے۔ وجے پنڈت ہی ہے نا۔ وہ منگل اشٹکا وشٹکا پڑھ لے گا بہت شور مچائے بغیر بیاہ ہو جائے گا، سکھی رہو گے، تم جانو تمھارا کام..... ہم بھلے کی کہتے ہیں۔ دن مت دیکھو۔ پچیس کا رتک، بدھ وار، شبھ لگن، شبھ مہورت، بس منگل اشٹکا اور سادھان۔''

ناگ پھنی اور کنول کو اپنی پتیاں بھیکتی ہوئی نظر آنے لگیں، جیوارام کی ذہنی تعمیر کے کنگرے آسمان سے باتیں کرتے کرتے بالکل آسمان سے جا ملے۔

جیوارام پروہت کے بیاہ کے لیے بہت ٹھاٹھ باٹھ کیا گیا۔ باجے بھی بجے اور ڈھولک بھی، مذاق بھی ہوئے اور قہقہے بھی بلند ہوئے۔ جیوا رام کا دل بھی دھڑکا، اور بہت زور زور سے فقط اتنی کسر تھی کہ چھاتی کی دیواریں نہ ہوتیں تو کبھی کا اُچک کر باہر آ رہتا۔

وجے نے دیکھا، پنڈت جیوارام کی نظریں بھی آوارہ ہو چکی تھیں اور مچل مچل کر اپنی ہونے والی بیوی کی گوری گوری کلائی پر چمکتی ہوئی چوڑیوں اور جسم جس کا چھریرا پن سات کپڑوں میں ملبوس ہونے پر بھی دکھائی دے رہا تھا کا جائزہ لے رہی تھیں اُس کی زوجہ نندہ کی طرح لمبی تھی اور اپنے شوہر سے سر نکالتی تھی اور یہ محض اتفاق کی بات تھی۔ وجے نے رسمیہ طور پر عہد کے لیے جیوارام کا ہاتھ اُس کی ہونے والی بیوی کے ہاتھ میں دیا۔ اس پر گیلا آٹا رکھا اور ساتواں منتر پڑھ دیا۔ چاروں طرف سے چاول وجے کے آگے گرنے لگے۔

وجے ایک استادنہ طرز سے پیسے منگل، سنیچر، گنیش وغیرہ کے خانوں میں رکھوا رہا تھا۔ کانپتے ہوئے جیوارام نے اشارے سے وجے کو بلایا۔ منتر گنگناتے ہوئے وجے نے اپنا کان جیوارام کے منہ کے پاس کر دیا۔ جیوارام نے کہا۔

''بھیا، میرا دل بہت دھڑک رہا ہے..... مَیں کانپ رہا ہوں دیکھتے نہیں مجھے سردی لگ رہی ہے۔ نیل رتن سے کہنا مجھے ذرا تھامے رکھے۔''

وجے برابر منتر گنگناتا گیا۔ وجے کا ایک اور ساتھی بولا۔ ''دادا، نیل رتن گیر ہٹ گیا ہے..... تم جانتے ہو رُلنا سے بہت دور نہیں ہے۔ آتا ہی ہوگا۔''

''وجے ٹھہرو۔'' جیوارام نے آہستہ سے کہا۔ ''منگل اشٹکا ابھی نہ پڑھو۔ مجھے سوچ لینے دو، میری عمر چالیس برس کی ہے۔ اور مَیں برہمچاری پنڈت ہوں.....''

وجے نے دیکھا، جیوارام سچ مچ بیاہ کے لیے بہت معمر تھا۔ اس کے گلے میں خشکی پیدا ہو رہی تھی۔ لب سوکھ گئے تھے جن پر جیوارام دیوانہ وار زبان پھیر رہا تھا۔ وجے نے آہستہ مگر ایک حقارت آمیز آواز سے جیوارام سے کہا۔ ''چھی چھی، تمھارے ایسے کمزور آدمیوں کے لیے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں، دادا۔ دنیا ایسے لوگوں کا مذاق اُڑایا کرتی ہے۔''

جیوارام کے بس کی بات ہوتی تو وہ منگل اشٹکا کا جاپ ہونے سے پہلے ہی اپنے پاک برہمچاریہ کو گرہست کی آلودگیوں سے بچا لے نکلتا۔ مگر اس نے دیکھا کہ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو اس کی ہونے والی بیوی نے بہت زور سے دبا رکھا تھا۔ شاید وہ سوچتی تھی کہ وہ ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں؟..... شاید شرارت کے طور پر۔ چنچل تھی ناں، جوانی تھی نا..... عورت!

پھر جیوارام منگل اشٹکا کے جلدی جلدی پڑھے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ تاکہ وہ جلد ہی اس ذہنی کوفت سے نجات حاصل کر لے۔ اور اپنی ہونے والی بیوی کا چہرہ دیکھے اس کے تخیل کی مشین چلنے لگی۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک دل فریب پہاڑی پر کھڑا ہے۔ پہاڑی کے دامن میں اس

کو ایک خوب صورت نیلی جھیل، اس میں تیرتے ہوئے بجرے، اس کے کنارے پر لہلہاتی ہوئی کھیتیاں، اور ساتھ ہی ماہی گیروں اور دہقانوں کے وہ جھونپڑے نظر آ رہے تھے۔ جن میں وہ لوگ ایسی مسرت سے سرشار تھے جس پر بادشاہوں کو بھی رشک آئے۔ اور ان سے پرے امراء کے محل جن میں وہ زر و دولت اور شان و شوکت کے باوجود غریبوں سے بھی زیادہ دکھی تھے۔ جھیل کے مشرقی کناروں پر پانی میں ناگ پھنی اور کنول اُگ رہے تھے۔ اور شیشم کے ایک پودے سے درخت کے نیچے کوئی تارک الدنیا سنیاسی ترئی پھونک رہا تھا۔ اور ترئی کی دل کش آواز اس بات کی یاد دلا رہی تھی جسے نسلِ انسان ازل سے بھولتی چلی آ رہی ہے..... فقط اب وہ اکیلا نہ تھا۔ اس کی بیوی بھی اس کے بازو میں بازو ڈالے محوِ نظارہ تھی۔ پانی میں ناگ پھنی اور کنول تر بہ تر ہو رہے تھے۔

یکا یک منگل اشٹکا نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ کتنا خوب صورت پُر معنی منتر ہمارے بزرگوں نے.....

'ساودھان' کی آواز آئی اور لوگوں نے مبارک باد دی۔

وجے نے اپ دیش دیا۔ بالکل جیوارام کی طرح۔ وجے نے آخر میں کہا۔

دس بکریوں کا مارنا برابر ہے ایک بیل مارنے کے

سو آدمیوں کا مارنا برابر ہے ایک براہمن مارنے کے

پاس ہی ایک شرارتی لڑکے نے آہستہ سے کہا

ایک من برابر ہے چالیس سیر کے

ایک سیر برابر ہے سولہ چھٹانک کے

اور وجے نے گھورتے ہوئے کہا۔ ''ہشت، ہشت''

شام کو جلدہ عروسی میں جیوارام نے اپنی دلھن کو گٹھڑی بنے ایک کونے میں بیٹھے دیکھا جیوارام کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اپنی بیوی کا منہ دیکھنے کی اس میں جرأت نہ تھی۔

'شاید یہ حرکت اُسے بُری لگے جیوارام نے دل میں کہا۔ ''عورت ہے نا.....''

جیوارام نے جتنی دفعہ کوشش کی۔ اتنی دفعہ ہی ناکام رہا۔ اُسے یہ محسوس ہونے لگا۔ جیسے اُس کے کمرے میں اور بھی بہت سے آدمی ہیں۔ اُسے واہمہ گردانتے ہوئے جیوارام نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ مگر پھر روک لیا۔

''تمھاری ایسی کمزور طبعیت والے آدمی کو تو دنیا آڑے ہاتھوں لیتی ہے..... چھی چھی، وجے کے الفاظ جیوارام کے کانوں میں گونجنے لگے۔''

جیوارام نے جب نہایت ہمت سے کام لے کر آناً فاناً دلھن کا منہ بے نقاب کیا تو دلھن دیوانی ہو کر تالیاں بجانے لگی۔ جیوارام کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اُس نے دیکھا کہ بیاہا ہوتے ہوئے بھی وہ کنوارا تھا۔ یا کنوارا ہوتے ہوئے وہ رنڈوا تھا یا.....''

دور چارپائی پر دلھن کی بجائے نہایت قیمتی کپڑوں میں ملبوس نیل رتن تالیاں بجا رہا تھا۔ اور باہر سے منگل اشٹکا کے اُونچے اُونچے جاپ

کے درمیان بے تحاشا قہقہے بلند ہو رہے تھے!!

☆☆☆

انوار صدیقی کے قلم سے ایک پراسرار اور خوفناک ناول

جوگی

قیمت 160/- روپے

- جوگی..... جو حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک تھا
- وہ انمول شئے کیا تھی جس نے جوگی کو دیوانہ بنا دیا تھا
- کفر اور ایمان کے درمیان جنم لینے والی پراسرار سرگزشت
- ایک ایسے گھرانے کی کہانی جس پر پراسرار موت کا سایہ تھا

شمیم نوید کے قلم سے ایک پراسرار سلسلہ

دیدبان

دو حصے شائع ہو چکے ہیں

- وہ دیوتاؤں کی چہیتی تھی
- پراسرار سرگوشیاں اس کی رہنما تھیں
- وہ سانپوں سے بڑھ کر زہریلی تھی
- پراسرار اور شیطانی قوتیں اس کی راہ میں حائل تھیں
- خیر و شر کا ازلی تصادم، ہنگامے جگاتی پراسرار داستان

قیمت فی حصہ 60/- روپے

سی ٹاپ

سی ٹاپ، مظہر کلیم کی عمران سیریز کا ایک ناول ہے جس میں پاکیشیا کا ایک انتہائی اہم سائنسی فارمولا یورپ کی مجرم تنظیم کے ہاتھ لگ گیا ہے جسے خریدنے کے لئے ایکریمیا اور اسرائیل سمیت تقریباً تمام سپر پاورز نے اس مجرم تنظیم سے مذاکرات شروع کر دیئے۔ گو یہ مجرم تنظیم عام بدمعاشوں اور غنڈوں پر مشتمل تھی لیکن اس کے باوجود تمام سپر پاورز اس تنظیم سے فارمولا حاصل کرنے کے لئے اسے بھاری رقم دینے پر آمادہ تھیں حتیٰ کہ عمران اور پاکیشیا سیکرٹ سروس کو بھی اس فارمولے کے حصول کے لئے اس تنظیم سے بار بار سودے بازی کرنا پڑی اور بھاری رقم دینے کے باوجود فارمولا حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ اس کے باوجود وہ اسے مزید رقومات دینے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ ایسا کیوں ہوا۔ کیا عمران اور پاکیشیا سیکرٹ سروس ایک عام سی مجرم تنظیم کے مقابل بے بس ہو گئے تھے؟ ہر لحاظ سے ایک منفرد کہانی، جس میں پیش آنے والے حیرت انگیز واقعات کے ساتھ ساتھ تیز رفتار ایکشن اور بے پناہ سسپنس نے اسے مزید منفرد اور ممتاز بنا دیا ہے۔ **سی ٹاپ** کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ایک چوہے کا پیغام

ابوالفرح ہمایوں

نہنگ واژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا موشِ عیّارا کو گر مارا

ایک سلیٹی رنگ کا بے ہنگم بھدا سا جانور، چوہا کہیں جسے، پچھلے دنوں ہمارے لیے سخت دردِ سر بنا ہوا تھا۔ کہنے کو تو چوہا ایک چھوٹا سا جانور ہے۔ مگر ہم جس چوہے کا ذکر کر رہے ہیں وہ کوئی معمولی چوہا نہ تھا۔ جسامت بلی کے برابر، چہرے پر شایانہ جاہ و جلال اور چال ڈھال ایسی کہ اچھے اچھوں کے ہوش اڑ جائیں۔ چستی اور پھرتی اس کی رگ رگ میں بھری ہوئی تھی۔ خطرے کی بو فوراً سونگھ لیتا اور پھر ایسا اڑنچھو ہو جاتا جیسے موقع واردات سے پولیس۔ بلا کا خوش خوراک اور حریص تھا، بلکہ اس معاملے میں کمینگی کی حد تک بدتمیز تھا۔ خرد و کلاں کا خیال کیے بغیر جو اشیائے خورونوش ہاتھ آتیں، دبا کر ایک کونے میں بیٹھ جاتا اور چیڑ چیڑ کر کھانا شروع کر دیتا۔ ہزار ہش ہش کرو، وہ کسی کی نہیں سنتا تھا، بلکہ دخل در معقولات کرنے والے کو ایسے خطرناک انداز میں گھورتا جیسے اسے کچا ہی چبا جائے گا۔ ایسا ڈھیٹ چوہا ہم نے بھلا کاہے کو کبھی دیکھا ہوگا۔ اس کی بے غیرتی دیکھ کر ایک مشہور کہاوت میں تحریف کے لیے دل مچلنے لگتا اور وہ تحریف یوں ہوتی۔ چہ ولاور است موشے کہ بکف چراغ دارد۔

بڑے سے بڑا اپیچ دار ڈبہ اور آہنی کلپ لگی بوتلیں کھول لینا اس کے بائیں پنجے کا کھیل تھا۔ ہم نے اس کی دست برد سے محفوظ رہنے کی کئی احتیاطی تدابیر اختیار کر ڈالیں۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ تاہم اس کی ایک خوبی کا ذکر نہ کرنا اسپورٹس مین اسپرٹ کے خلاف ہوگا۔ رفع حاجت کے لیے وہ سیدھا بیت الخلا کا رخ اختیار کرتا۔ ناسمجھ بچوں کی طرح نہیں کہ جب اور جہاں بھی چاہا فراغت حاصل کر لی۔ فلش پر باقاعدہ بیٹھ تو نہیں سکتا تھا چناں چہ اس کے آس پاس لوٹ پوٹ کر اپنی مشکل آسان کر لیتا۔

بازار میں بکنے والی بے شمار چوہے مار دوائیں اس پر آزما چکے تھے، لیکن وہ بہ دستور ہمارے سینے پر مونگ دلتا رہا۔ بلکہ اب تو یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ دوائیں اس کے ''کشتۂ جاں فزا'' ثابت ہو رہی ہیں کیوں کہ وہ ہر دن پہلے کے مقابلے میں زیادہ تن و مند نظر آتا تھا۔ جو لوگ صحت مند اور تندرست ہونے کے لیے قیمتی دوائیں استعمال کرتے ہیں، ان کو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ چوہے مار دوائیں کھایا کریں۔ کم خرچ بالانشیں۔ ہم خود بھی اپنے آپ پر یہ تجربہ کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔

بیگم صاحبہ کئی دنوں سے کہہ رہی تھیں کہ اب بازاری دوائیں کھلانے کا سلسلہ بند کریں اور کوئی دوسرا بندوبست کریں۔ اسے مارنے کے لیے دوا کی نہیں بلکہ کلاشنکوف کی ضرورت پڑے گی۔ ہم عدیم الفرصت ہونے کا بہانہ کر کے کافی عرصے تک ٹالتے رہے، لیکن کب تک بالآخر ہم نے یہ طے کر لیا کہ آنے والا اتوار اس مہم کی نذر کر دیں گے۔ آخر کار اتوار آ گیا۔ ہمیں پہلے ہی معلوم تھا کہ کچن اس کو سب سے زیادہ محبوب ہے اور اوون کا

عقبی حصہ اس کا بیڈ روم۔ بیگم صاحبہ نے فتویٰ صادر کر دیا کہ آج چوہے کو ہلاک کیے بغیر ناشتہ کرنا حرام ہے۔ چناں چہ ہم نے صبح ہی صبح کمر کس لی اور مجاہدانہ جذبے کے ساتھ میدان کارزار میں کود پڑے۔ لوہے کا ایک چار فٹ طویل پائپ ہم نے ہاتھوں میں سنبھالا تا کہ چوہے سے تقریباً چار فٹ تو دور رہ سکیں۔ پھر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بیگم اور بچوں کے ہاتھوں میں جوتے دے کر کھڑا کر دیا اور ہدایت کر دی کہ خبردار، چوہا بھاگنے نہ پائے۔ اس جنگی حکمتِ عملی کو اپنانے کے بعد ہم نے ایک ہاتھ میں پائپ پکڑا اور دوسرے سے اوون کو بجانا شروع کر دیا تا کہ شور کی آواز سے چوہا باہر نکلے اور ہمارے بہادر جوان جوتے کے ایک ہی وار میں اس کا سر کچل ڈالیں۔ بجائے اس کے کہ اس کم بخت پر کوئی اثر ہوتا، ہم پر ایک سرور سا طاری ہو گیا اور اوون بجاتے بجاتے ہم ایک مشہور فلمی دھن بجانے لگے۔

کچھ دیر بعد اچانک ہماری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ بچے قہقہے لگاتے ہوئے ہماری دھن کی مناسبت سے تالیاں بجا رہے تھے۔ دوسری جانب بیگم صاحبہ خوں بار نگاہوں سے ہمیں گھور رہی تھیں۔ ''یہ کیا ہو رہا تھا؟'' ان کی ہولناک آواز گونجی۔ ہم سہم کر رہ گئے۔ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ ہم نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا اور دوبارہ چوہے کی جستجو میں لگ گئے۔ اس اثناء میں وہ عیار چوہا ہماری منصوبہ بندی سے واقف ہو کر فرار ہو چکا تھا۔ اب ہم نے اس کی تلاش میں بچے دوڑا دیے۔ ادھر دیکھا، ادھر جھانکا بستروں اور تکیوں کے نیچے ادھیڑ کر رکھ دیے۔ ایک ایک برتن کھنگال ڈالا، کھڑکیوں اور دروازوں کے پردوں کے پیچھے دیکھا، لیکن وہ نہ جانے کہاں روپوش ہو گیا تھا۔ اب باری تھی غسل خانوں کی، اپنی تمام تر ہمتیں مجتمع کر کے ہم ڈرتے ڈرتے ایک غسل خانے کا دروازہ کھولتے، ادھر ادھر دیکھتے اور جب یقین ہو جاتا کہ وہ خبیث وہاں نہیں ہے تو اپنا سینہ پھلا کر اندر داخل ہو جاتے اور فخر سے گھر والوں کو مطلع کرتے کہ چوہا یہاں نہیں ہے۔

اس طرح ہم نے گھر کے سارے غسل خانے اور اسٹورز وغیرہ دیکھ ڈالے۔ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہو کہ یکا یک کال بیل بج اٹھی۔ ہم دروازے کی جانب لپکے۔ دروازہ کھولا تو اوپر رہنے والے کرائے دار بڑے تحکمانہ انداز میں بولے ''موٹر چلا دیجیے، پانی کا ایک قطرہ نہیں ہے۔'' دروازہ بند کر کے جیسے ہی ہم پانی کی موٹر کر قریب آئے تو ہم پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ ہم ایک فلک شگاف چیخ مار کر پیچھے کو الٹ گئے اور چوہا ہمارے پیروں کو چھوتا ہوا دوبارہ گھر میں گھس گیا۔ ہمیں فی الفور کرسی پیش کی گئی۔ شربت پلایا گیا اور حوصلہ افزائی کے کلمات ادا کیے گئے۔ اس قدر عزت افزائی کے بعد ہم نے سنبھالا لیا اور تیر و تفنگ سے لیس ہو کر دوبارہ جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ بیوی بچوں کو پہلے کی طرح جوتوں اور چپلوں سے مسلح کر دیا اور خود اپنا پائپ سنبھال کر چوہے کی جانب لپکے جو فریج کے نیچے پناہ لیے ہوئے تھا۔ ہم نے آگے بڑھ کر بجلی کا بٹن آف کیا اور پھر آہستہ آہستہ پائپ کو فریج کے نیچے داخل کرنا شروع کیا۔ مگر وہ چوہا نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ بجائے اس کے کہ فرار ہونے کی کوشش کرتا، وہ فریج کے عقب میں نقب لگاتا ہوا اوپر کی طرف چڑھتا چلا گیا۔ فریج کی چھت پر پلاسٹک کی ٹوکریاں وغیرہ رکھی ہوئی تھیں۔ اچانک وہاں پہنچ کر ہلچل سی ہوئی۔ ابھی ہم نے وار کرنے کے لیے پائپ اٹھایا ہی تھا کہ چوہے نے پہل کرتے ہوئے ایک زبردست چھلانگ لگائی۔ ہمارے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکلی اور ہم نے جھکائی دے کر بڑی مشکل سے اپنے آپ کو بچایا۔ اب وہ ڈرائنگ روم میں صوفوں کے پیچھے دوڑ لگا رہا تھا۔ مگر ہم نے بھی دل میں یہ ٹھان رکھی تھی کہ اس موذی کو آج ٹھکانے لگا کر ہی دم لیں گے لہٰذا ایک نعرۂ مستانہ لگایا اور جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر اس کا تعاقب کرنے

لگے۔اب بیگم صاحبہ سپہ سالار کے فرائض انجام دیتے ہوئے ہمیں ہدایات جاری کر رہی تھیں۔ ''وہ دیکھیے! اُدھر ٹوٹی ہوئی ٹانگ والے صوفے کے پیچھے ہے۔داہنی جانب سے دبے پاؤں آگے بڑھیں اور ایک ہی وار میں اس کا خاتمہ کر دیں'' ہم تیزی سے آگے بڑھے اور دو چار پائپ چوہے کے سر پر دے مارے۔لیکن چوہا وہاں کہاں تھا۔وہ تو چھلاوے کے مانند دوسری طرف کھڑا ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔اچانک بچوں نے شور مچایا۔''ابو! ابو! وہ آپ کے کمرے میں جا رہا ہے'' اور سب کے سب گرتے پڑتے کمرے کے جانب بھاگے۔چوہا پلنگ کے نیچے بیٹھا دور سے ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دعوتِ مبارزت دے رہا تھا۔ہم سے اس کی یہ دیدہ دلیری برداشت نہ ہو سکی۔ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک جوتا اٹھایا اور نشانہ تاک کر پوری قوت سے اس کے منہ پر دے مارا۔جواب میں ایک دل خراش چیخ سن کر ہم خوشی سے جھوم اٹھے لیکن جب غور سے دیکھا تو چھوٹے صاحبزادے اپنے بائیں پیر کا انگوٹھا پکڑے ناچ رہے تھے۔ابھی بیگم صاحبہ نے ہماری جانب گھور کر دیکھا ہی تھا کہ اتنے میں چوہا بستر پر جا چڑھا اور تکیے کے اندر سرنگ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ہم نے جیسے ہی پائپ اٹھایا، وہ اپنی کارروائی ادھوری چھوڑ کر لائبریری کی سیر کو جا پہنچا۔وہ دیکھیے کتابوں کے بنڈل کے پیچھے بیٹھا ہے۔جلدی سے سب ہم آواز ہو کر چلائے۔یہ سنتے ہی ہم نے کتابوں کے ڈھیر کو دھکا مار کر ڈھیر کر دیا۔یہ سوچ کر کہ وہ اس اچانک حملے سے سنبھل نہ پائے گا اور کتابوں میں دب کر راہیِ ملک عدم ہو جائے گا۔لیکن ایں خیال محال است وجنوں است اس اثناء میں وہ ایک لمبے پردے پر چڑھ چکا تھا۔ہم پھونک پھونک کے قدم بڑھاتے ہوئے اس کی جانب بڑھے اور ایک زبردست حملہ کر دیا۔اپنی مدافعت میں چوہے نے ایک ہیبت ناک چیخ ماری اور ہماری جانب لپکا۔اچانک ہمیں اپنے کاندھوں پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا اور ہم تھر تھر کانپنے لگے۔دیکھا تو بیگم صاحبہ اپنے دونوں ہاتھ ہمارے کاندھوں پر رکھ بڑی ادا سے مسکرا رہی تھیں۔چوہا مارنے کے لیے بہت دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے...ہمارے چہرے پر ایک خفت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔(ویسے ہم تلملا کر رہ گئے تھے)۔ہمارے بارے میں بیگم صاحبہ کا یہ طنزیہ تبصرہ سن کر چوہے نے نہایت فخر و انبساط کے عالم میں اپنے سر کو ایک ہلکی سی جنبش دی، گویا اسے تمغائے شجاعت مل گیا ہو، پھر ہماری طرف فاتحانہ انداز سے دیکھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔اسے دیکھ کر نہ جانے.....ایسا کیوں محسوس ہوا، جیسے کہہ رہا ہو: ''تم ہمیں کیا مارو گے، ہم خود ہی برضا و رغبت یہ گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔تم جیسے کم ہمت اور مسکین شوہر کے ساتھ رہنا ہمیں خود بھی گوارا نہیں''۔

☆☆☆

http://kitaabghar.com
http://kitaabghar.com

مشن امن

مشن امن صائمہ الٰہی کے بچوں کے لیے لکھے گئے ڈراموں کا مجموعہ ہے، جو زیادہ تر بچوں کے مقبول ماہانہ ڈائجسٹ **نٹ کھٹ** میں چھپے ہیں۔ڈراموں کا یہ مجموعہ کتاب گھر کے بچوں کے ادب (**بزم اطفال**) سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

رانگ نمبر.....

عزیز جبران انصاری

ٹرن ٹرن.....ٹرن ٹرن.....ٹرن ٹرن

مَیں کمپیوٹر پر بیٹھا اپنے کام میں مصروف تھا کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو!''

''عافیہ ہیں؟ ان سے بات کرائیں''

''آپ نے کہاں فون کیا ہے؟ یہاں کوئی عافیہ نہیں ہوتیں''

''یہ.....0213 نمبر نہیں ہے؟''

''جی نمبر تو یہی ہے لیکن یہاں کوئی عافیہ صاحبہ نہیں ہوتیں'' مَیں نے فون بند کرنا چاہا لیکن دوسری جانب سے ایک کھنکتے ہوئے قہقہے کے ساتھ کہا گیا۔ ''آپ مذاق کر رہے ہیں ناں۔ سچ بتایئے آپ مذاق کر رہے ہیں ناں۔''

اس جملے کے ساتھ ہی دو تین دبے دبے سے قہقہے اور سنائی دیے۔ اب مَیں نے بھی فون بند کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ ''چلیں تھوڑی سی تفریح ہی سہی'' مَیں اب واقعی مذاق کے موڈ میں آ گیا تھا۔

''بی بی آپ نے اتنی دور سے کیسے اندازہ کر لیا کہ مَیں مذاق کر رہا ہوں؟''

''جی یہی تو ہمارا کمال ہے اور بائی دے وے ہم آپ کی بیوی کیسے ہو گئے ابھی نکاح تو ہوا ہی نہیں۔''

دوسری طرف سے دبے دبے سے قہقہے جاری تھے۔ وہ بی بی کو بیوی سمجھی تھیں اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ کوئی برگر فیملی تھی اور ان کی اردو واجبی سی ہو گی۔ مَیں نے بھی لطف لینے کے لیے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا، ''تو رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے؟''

''جی کیا فرمایا؟ مَیں کچھ سمجھی نہیں؟''

''سمجھنے میں بھلا کتنی دیر لگتی ہے۔ کیوں کہ جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا بھلا بے چارہ قاضی''

''اچھا اچھا آپ وہ جماعت اسلامی والے قاضی صاحب کی بات کر رہے ہیں ناں؟ جی ہاں مجھے بھی ہر معاملے میں ان کی ٹانگ اڑانا پسند نہیں ہے، لیکن یہ جو ابھی آپ نے رشتہ وشتہ کچھ کہا تھا اس کا کیا مطلب تھا۔''

''اجی ہم نے سوچا کہ آپ اگر ہماری بیوی اب تک نہیں بنی ہیں تو اب بنائے لیتے ہیں دو بول ہی تو پڑھوانے ہیں؟''

''بغیر دیکھے ہی؟'' دوسری جانب سے شوخی آمیز شرارت سے کہا گیا۔

''دیکھا تو محبوبہ کو جاتا ہے اور بیوی کو کیا دیکھنا'' میں نے بھی شرارت سے کہا۔

''بڑے تجربے کار معلوم ہوتے ہیں''

''بڑے تو نہیں ہاں چھوٹے موٹے تجربہ کا.....''

''دیکھیے آپ کو ہم اپنے موبائل سے کال کر رہے ہیں۔ ہمارا بیلنس ختم ہو رہا ہے ایسا کیجیے ہمارے نمبر پر دو سو روپے کا بیلنس سینڈ کر دیجیے پھر آپ ہمارے نمبر پر بات کریں ساری رات پڑی ہے تفصیل سے معاملات طے کر لیں گے ہمیں آپ کی باتیں بہت اچھی لگ رہی ہیں'' دوسری طرف سے بات کاٹ کر کہا گیا۔ ''لیکن ہمارے پاس تو موبائل ہے ہی نہیں اور یہ ٹیلی فون بھی نان پیمنٹ کی وجہ سے یک طرفہ ہو رہا ہے۔'' ہمارا یہ کہنا تھا کہ ٹیلی فون کھٹ سے بند ہو گیا۔

☆☆☆

شکنجہ

شکنجہ ناول پاکستان میں ہونے والی تخریب کاری کے پس منظر میں لکھا گیا ہے ہمارے ہاں گذشتہ کچھ سال سے ''ٹریک ٹو ڈپلومیسی'' کا غلغلہ کچھ زیادہ ہی زور شور سے مچایا جا رہا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ محبتوں کے جو زنگ آلود دروازے حکومتیں نہیں کھول سکیں وہ شاید عوام بلکہ عوام بھی نہیں دانشور خواتین و حضرات اپنی مساعی سے کھولنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

لیکن.....اس ٹریک ڈپلومیسی کی آڑ میں کیا گھناؤنا کھیل رچایا جا رہا ہے بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیاں ''بھولے بادشاہوں'' کو کس کس طرح اپنے جال میں پھانستی ہیں اور ان سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ یہی اس ناول کا موضوع ہے۔

ایک اور بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ پاکستان اپنے ہاں ہونے والے ہر واقعے کی ذمہ داری ''را'' پر ڈال دیتا ہے۔ یہ بات کس حد تک سچ ہے؟ کس حد تک جھوٹ؟ شاید ان سوالات کے جواب بھی آپ کو اس ناول کے مطالعے سے مل جائیں۔ محبتوں کی آڑ میں منافقتوں کا دھندہ کون چلا رہا ہے؟ دشمن کی سازش کیسے انجام پاتی ہے اور اس سازش کا شکار ہم انجانے میں کیسے بن جاتے ہیں میں نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناول کتاب گھر کے **ایکشن ایڈونچر جاسوسی** سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

عورتیں مسکرانا کیا جانیں.....!

ڈاکٹر سیّد صابر علی ہاشمی

عورتیں یا تو غلط موقع پر ہنستی ہیں یا بالکل نہیں ہنستیں۔ مَیں ایک سنکی سی عورت کو جانتا ہوں جو لطیفہ سننے کے بعد کہتی ہے: ''ہوں' پھر کیا ہوا؟'' ایک دوسری خاتون لطیفے کے دوران اوّل سے آخر تک ہنستی ہے' پھر سنجیدہ ہو جاتی ہے اور پوچھتی ہے ''کیا بجا ہے؟''

عورتیں اپنے اردگرد شدید حقیقت پسندی کا فولادی خول لے کر چلتی ہیں' یہ خول انھیں اونچا اُچھلنے نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ مجلسی ظرافت کا ان پر ردِ عمل نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتی ہیں کہ لطیفوں کی دُنیا معقولیت پسندی سے دور ہے۔

ایک رات مَیں گھر آیا دروازے میں قدم رکھتے ہی مَیں نے کہا: ''ذرا سننا' کیسا گرما گرم لطیفہ ہے۔'' ایک بڑی بی کو کراچی سے لاہور جانا تھا' جب گاڑی میں سوار ہوئیں' تو نہایت سلیقے سے پلیٹ فارم پر جوتی اُتار دی۔ لاہور پہنچ کر جب گاڑی سے اُتریں تو پلیٹ فارم پر ایک ایک سے پوچھتی پھریں: ''اے بیٹا! میری جوتی کون لے گیا' یہیں تو اتاری تھی۔''

آخری جملہ کہتے کہتے مَیں ہنسی کی شدت سے کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ میری بیوی نے کہا: ''خیر' یہ بتاؤ پنیر لائے کہ نہیں۔'' رات کو یہی لطیفہ مَیں نے بچوں کے سامنے بیان کیا۔ اجمل ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا' نرگس کہنے لگی: ''ہائے بے چاری' ننگے پیر گھر گئی ہو گی۔ آج کل مہنگائی کا زمانہ ہے' جوتی کیسے خریدی ہو گی۔''

اتنے میں بیگم صاحبہ آ گئیں۔ انھوں نے مہنگائی کی بات سن لی تھی' کہنے لگیں: ''ہاں بھئی چیزوں کی قیمتیں آسمان پر پہنچ گئی ہیں۔ مَیں تو آج پڑوسن سے کہہ رہی تھی کہ اگر قیمتیں یوں ہی بڑھتی رہیں تو مجھے کوئی دوسرا دولت مند شوہر تلاش کرنا پڑے گا۔''

اس پر ماں اور بیٹی فلک شگاف قہقہے لگانے لگیں۔ مَیں اور اجمل احمق بنے بیٹھے رہے۔

مرد' عورت کی نسبت مزاح سے لطف اُٹھانے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ مرد تو کوئی لطیفہ سنانے کے لیے تجارتی کانفرنس بھی تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کر دیتا ہے' مگر عورت لطیفہ صرف اس وقت سنتی ہے جب برتن صاف ہو چکتے ہیں' بچے کھاپی کر اپنے کام میں لگے ہوتے ہیں اور وہ شام کی سیر کے لیے نکلتی ہے۔ اس وقت بھی وہ بے دلی سے لطیفے سنتی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار مَیں نے اپنی بیوی سے کہا: ''دو آدمی ایک کلب میں بیٹھے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا: یہ سن کر بڑا افسوس ہوا کہ آج تم نے اپنی بیوی کو دفن کر دیا ہے۔ دوسرا بولا: کیا کرتا' مر گئی تھی۔''

میری بیوی نے ایسی نظر سے دیکھا کہ مسکراہٹ میرے لبوں پر دفن ہونے لگی۔ اس نے کہا: ''وہ کس بیماری سے مری تھی؟''

مَیں نے اس کی ذہانت سے شرمندہ ہو کر کہا۔ ''ذرا غور تو کرو' ایک آدمی کہتا ہے' یہ سن کر بڑا افسوس ہوا.....''

''مَیں نے سن لیا ہے۔'' محترمہ نے کہا۔ ''چیخ کر بات مت کرو۔ اگر تم یہ وتیرہ اختیار کرو گے تو مَیں تمھاری بات نہیں سنوں گی۔''

عورتیں، مرد کو غیر سنجیدہ اور مسخرہ سمجھتی ہیں مگر وہ یہ بات صاف صاف نہیں کہتیں۔ مَیں نے ان موقعوں پر عورتوں کو ہسٹریائی ہنسی ہنستے دیکھا ہے، جب وہ شوہر کے ''فنِ خریداری'' یا کار چلانے کا تذکرہ کر رہی ہوں، لیکن یہی قصے مرد بیان کرے تو سب منہ بسورنے لگیں گی اور کہیں گی: ''بن رہا ہے۔''

اکثر ایسا ہوا ہے کہ کسی دعوت میں کوئی لڑکی لطیفہ بیان کر رہی ہے۔ ساری خواتین قہقہے لگا رہی ہیں، مَیں نے اسی نوعیت کا کوئی لطیفہ بیان کیا۔ بس صاحب، سب خاموش ہو گئیں۔ لطیفے کے دوران خواتین بغلیں جھانکنے لگیں اور موضوع بدلنے کی کوشش کرتی رہیں۔

''عذرا تمھارے بال بڑے پیارے لگتے ہیں! اچھا ہے تم انھیں نہیں ترشواتیں۔''

جب عورتوں میں حسِ مزاح نہیں ہوتی، تو وہ ہنستی کیوں ہیں؟ مجھے اُمید ہے کہ یہ راز مَیں کسی دن معلوم کر سکوں گا۔

☆☆☆

دجّال (شیطان کا بیٹا)

انگریزی ادب سے درآمد ایک خوفناک ناول۔ علیم الحق حقی کا شاندار اندازِ بیاں۔ شیطان کے پجاریوں اور پیروکاروں کا نجات دہندہ شیطان کا بیٹا۔ جسے بائبل اور قدیم صحیفوں میں بیسٹ (جانور) کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ انسانوں کی دُنیا میں پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارے درمیان پرورش پا رہا ہے۔ شیطانی طاقتیں قدم قدم پہ اسکی حفاظت کر رہی ہیں۔ اسے دُنیا کا طاقتور ترین شخص بنانے کے لیے مکروہ سازشوں کا جال بنا جا رہا ہے۔ معصوم بے گناہ انسان، دانستہ یا نادانستہ جو بھی شیطان کے بیٹے کی راہ میں آتا ہے، اسے فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

دجّال..... یہودیوں کی آنکھ کا تارہ جسے عیسائیوں اور مسلمانوں کو تباہ و برباد اور نیست و نابود کرنے کا مشن سونپا جائے گا۔ یہودی کس طرح اس دُنیا کا ماحول دجال کی آمد کے لیے سازگار بنا رہے ہیں؟ دجالیت کی کس طرح تبلیغ اور اشاعت کا کام ہو رہا ہے؟ دجّال کس طرح اس دُنیا کے تمام انسانوں پر حکمرانی کرے گا؟ 666 کیا ہے؟ ان تمام سوالوں کے جواب آپ کو یہ ناول پڑھ کے ہی ملیں گے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ اس ناول کو شروع کرنے کے بعد ختم کر کے ہی دم لیں گے۔ دجال کا پہلا اور دوسرا حصہ کتاب گھر پر دستیاب ہیں۔

''نگار ہائے فتنہ گر''

محمد عبدالقادر تاباںؔ اسلام آباد

مَیں نے پہلی بار اُسے بھینسوں کے باڑے میں دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ حالانکہ حالات قطعاً عشق افزا نہ تھے فضا میں دودھ اور گوبر کی ملی جلی بُو پھیلی ہوئی تھی دودھ خریدنے والے بچوں کا شورِ قیامت، برتنوں کی کھڑ کھڑاہٹ، کبھی کبھی کسی بھینسے یا بھینس کے ڈکرانے کی آواز..... گویا ماحول انتہائی نامعقول اور خاص طور پر معاملاتِ عشق کے لیے، حوصلہ شکن تھا..... لیکن اس نامعقول ماحول میں بھی اُس کا داخلہ بڑا خوشگوار لگا..... جیسے..... جیسے..... گوبر کے ڈھیر سے جگنو نمودار ہو۔ جیسے کوڑے کے ڈبّے میں سے کڑکڑاتا ہو ہزار کا نوٹ مل جائے... یا پھر.... بقول شاعر۔

جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے

اُس دشمن ہوش وخرد، غارت گرِ دل وجگر کے بھیگے بھیگے سیاہ ریشمی بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ گویا ابھی ابھی غسل کر کے آئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ستارے چمک رہے تھے۔ اُس کے رُخساروں پر شعلے رقصاں تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے ابھی کوئی شعلہ بُھوسے کی بوریوں پر جا پڑے گا اور سارا باڑا اجل کر راکھ ہو جائے گا۔ مَیں نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنا چاہا لیکن ہزار کوشش کے باوجود میری نظر اُس کے چہرے سے نہ ہٹ سکی..... ''تین پاؤ دودھ!'' اُس نے غفار سے کہا۔ اور میرے ذہن میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ غفار دودھ والا ادھیڑ عمر سہی، لیکن یقیناً اُس نے بھی اپنے وسیع وعریض سینے میں ایک خوبصورت دل چھپا رکھا ہوگا جو ظاہر ہے دھڑکتا بھی ہوگا۔ جبھی تو اُس نے اس کے حکم کی فوراً تعمیل کی..... وہ دودھ لے کر چلی گئی۔ مَیں نے دیکھا کہ دنیا اچانک خوبصورت ہوگئی ہے۔ یہ باڑا مجھے پہلے کبھی پسند نہ تھا۔ مَیں امی کی ڈانٹ کھا کر بادل نخواستہ دودھ لینے آیا کرتا تھا۔ یہاں دودھ لینے والوں کا بہت رش ہوتا تھا۔ کم از کم آدھ گھنٹے سے پہلے تو باری آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ مجھے گوبر، بھینسوں، اور خود غفار باڑے والے سے سخت نفرت تھی۔ وہ اپنی موٹی سی توند کے نیچے دودھ کی بالٹی دابے بیٹھا رہتا۔ اپنی کریہہ توند سے وہ دونا جائز مفادات بھی حاصل کرتا۔ ایک تو اُسے دودھ کی بالٹی پر بطور ڈھکن استعمال کرتا دوسرے دودھ ڈالنے کے لیے وہ برتن توند ہی پر رکھ کر بھرتا۔ اُسکا پورا بدن چربی کی دبیز تہوں میں ملفوف تھا۔ مَیں نے ایک بار ازراہ ہمدردی اُسے مشورہ دیا تھا کہ وہ مستقل بیٹھا رہنے کی بجائے کبھی کبھار چل پھر بھی لیا کرے۔ ورنہ ایک دن غفار ختم ہو جائے گا اور فقط چربی کا ڈھیر رہ جائے گا۔ جس کے اندر سے غفار کی تلاش موئن جوڈرو کی دریافت سے کم نہ ہوگی۔ جواباً اُس نے سرد آہ بھر کر کہا تھا، ''کیا کروں بیٹا! کام ہی بیٹھنے کا ہے اگر ایسا نہیں کروں گا تو اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کیسے پالوں گا؟''..... مَیں نے اُس کے پیٹ کو بہ غور دیکھتے ہوئے کہا، ''چاچا! تمھارے بچوں کا تو پتا نہیں لیکن مَیں دیکھ رہا ہوں کہ تمھارا پیٹ اب کافی پل چکا ہے۔ اُسے مزید نہ پالو، ورنہ کسی روز پھٹ جائے گا۔'' میرے اس معقول مشورے کا غفار پر انتہائی نامعقول اثر ہوا۔ مغلظات کا ایک طوفان اُس کے مُنہ سے برآمد ہوا اور مَیں سہم کر کافی دور چلا گیا۔ اُسی دن سے ازراہ اِنتقام وہ مجھے دودھ دینے میں مزید تاخیر کرنے لگا اور میرے نزدیک اُس کی مکروہ صورت دیکھنا ایک قبیح فعل ہو

گیا۔لیکن اب..... اب ہر شے نکھری نکھری۔ بدلی بدلی لگ رہی تھی۔ ہر شے پر پیار آ رہا تھا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا حُسن بھینسوں میں بھی ہو سکتا ہے۔ مَیں نے بھینسوں کی طرف دیکھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ کئی بھینسوں نے شرارت سے مجھے آنکھ بھی ماری۔ مَیں نے شرما کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ غفار کی رنگت بھی اچانک نکھر گئی تھی۔ وہ بہت معصوم لگ رہا تھا۔ میرا جی چاہا، اُس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اُس کے کھردرے گال پر بوسۂ عقیدت ثبت کر دوں۔ اُس کی موٹی سی پیاری توند کو آہستہ آہستہ سہلاؤں۔ ممکن تھا کہ مَیں اپنے جذبات کا عملی مظاہرہ بھی کرتا کہ غفار کی ڈھول جیسی کرخت آواز نے سارا ماحول پھر سے پراگندہ کر دیا۔ ''لے پکڑ بے دودھ!'' میری آنکھوں میں اُس کے لیے پرانی نفرت عود کر آئی، تاہم کسی ردِعمل کا اظہار کیے بغیر مَیں دودھ سے لبریز ڈول اور دل سے محروم سینہ لے کر گھر آ گیا۔

کہنے کو تو مَیں باڑے سے واپس آ گیا۔ لیکن بکھرا بکھرا، ذہنی انتشار کا شکار، بہ ظاہر پورا اندر سے ادھورا، کیوں کہ دل وہیں رہ گیا جاں وہیں رہ گئی اُس حسینۂ دلنواز و دلربا کے تیکھے نقوش آنکھ کی پتلی میں پیوست ہو گئے تھے

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں

یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

لحظہ لحظہ اضطراب بڑھنے لگا۔ مَیں نے جاگتی آنکھوں سے عجیب عجیب سپنے دیکھے۔ کئی بار فلمی ہیرو کی طرح اُسے ولن کی دست درازیوں سے بچایا۔ اُس کے پیچھے دوڑتے ہوئے فلمی گیت گائے۔ کئی بار ماتھے پر سہرے کے پھول کھلائے حجلۂ عروسی میں داخل ہوا۔ جہاں وہ قاتلہ سُرخ جوڑے میں سرتاپا خطرے کا نشان بنی بیٹھی تھی۔ (حالانکہ مستقبل قریب میں اس خطرے کا کوئی امکان نہ تھا..... کیوں کہ ابھی مَیں صرف دسویں جماعت کا طالب علم تھا)

طبیعت جب زیادہ خراب ہوئی تو مَیں گھبرا کر یارِ غار انیس کے پاس پہنچا اور سارا ماجرائے دل ایک سانس میں کہہ ڈالا۔ اُس نے واردات بہ غور سُنی اور ایک طویل ''ہوں.....!'' کھینچ کر بولا

''تو اب تم کیا چاہتے ہو؟.....''

''کیا چاہتا ہوں!؟ یار! تم عجیب ہونق آدمی ہو۔ تمھیں سمجھ نہیں آ رہی کہ مَیں اُس گمنام حسینہ پر عاشق ہو چکا ہوں۔''

''اب جب کہ یہ واردات ہو ہی چکی ہے، تو مَیں کیا کر سکتا ہوں! اگر عاشق ہونے سے پہلے تم میرے پاس آتے تو مَیں یقیناً تمھیں اس حرکتِ نازیبا سے باز رکھنے کی کوشش کرتا!''

''گویا اب تُم مدد کرنے کی بجائے میرا مذاق اڑاؤ گے!'' مَیں نے خفگی کا اظہار کیا۔ ''نہیں یہ مذاق نہیں! مَیں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں، بلکہ یوں سمجھو جتنا سنجیدہ مَیں اُس وقت ہوں، پہلے کبھی نہ تھا''

''یار! تو ہمیشہ یہی کہتا ہے!''

''وہ.....'' انیس گلا صاف کرتے ہوئے بولا، ''دراصل مَیں ہر روز پہلے سے زیادہ سریس ہوتا ہوں''

''دیکھا اے انیس جاں!'' مَیں نے آواز کو حتی الامکاں پُر سوز بناتے ہوئے کہا، ''اگر تو نے آج میری مدد نہ کی تو یقین کر ایک مخلص دوست سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائے گا''۔.....

''مخلص دوست!'' اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا ''کون سا مخلص دوست!؟''

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، کمبخت مجھ سے پوچھ رہا ہے کون سا مخلص دوست،..... میرے سوا اور کون ہو سکتا تھا؟۔ مَیں! جس نے گھر کے سودے سلف سے پیسے بچا بچا کر اُسے فلمیں دکھائی تھیں۔ اُس کے ساتھ دیر تک گھر سے باہر رہنے پر مار کھائی تھی، لیکن گھریلو تحقیقاتی کمیشن پر کبھی یہ ظاہر نہ ہونے دیا، ورنہ والد صاحب کی شکایت پر اُس کے گھر والے بھی اُسے زدوکوب کرتے۔'

''مَیں! اور کون،؟'' مَیں نے کڑک کر کہا، ''اے ناسپاس! کیا تجھے میرے اُس خلوص پر شک ہے جو آج تک غیر مشروط طور پر تیری نذر کرتا رہا ہوں؟.....''

''اوہ'' اُس نے دانت نکال دیے ''مَیں بھی کتنا بے وقوف ہوں بھلا تمھارے خلوص پر کیسے شک کیا جا سکتا ہے۔ مگر مجھے بتاؤ مَیں کیا کروں؟''

''کسی طرح پتا چلاؤ کہ وہ مہ جبیں کون ہے؟ اور کوئی ایسا انتظام کرو کہ جیسے اُس کے عشق نے مجھے چاروں خانے چت کر دیا ہے اُسی طرح میرا عشق بھی اُس کے چودہ طبق روشن کر دے۔ جس طرح میرا دل اُس کے قبضے میں چلا گیا ہے اُس کا دل بھی میری مٹھی میں آ جائے''

''لیکن ابھی کل تو تمھارا دل نسیم کے قبضے میں تھا۔ یار! آج تم صاف صاف بتاؤ تمھارے کُل کتنے دل ہیں آخر!؟'' انیس نے بالآخر وہی نامعقول بات کہی جس کا مجھے پہلے سے اندیشہ تھا.....

''وہ.....'' مَیں نے پشیمانی سے کہا، ''دراصل یار! اب تُم سے کیا چھپا ہے۔ نسیم بلاشبہ ایک حسین و جمیل لڑکی ہے، اس میں وہ تمام خوبیاں بدرجہ اُتم موجود ہیں۔ جن کی بنا پر کوئی بھی شخص، کسی بھی وقت اُس پر عاشق ہو سکتا ہے۔ لیکن..... لیکن جمالیاتی احساسات سے بالکل عاری ہے۔ تمھیں اُس کا کل والا دل شکن رویّہ تو یاد ہی ہوگا۔ ہم نے کوئی دست درازی تو نہ کی تھی۔ صرف درد بھرا فلمی گیت گاتے ہوئے دو تین بار اُس کے در کے سامنے سے گزرے تھے۔ بس اتنی سی بات پر وہ شعلہ رُخ.... شعلہ زبان و شعلہ جوالہ بن گئی۔ اُس نے نہ صرف خود ہماری شان میں نازیبا کلمات ادا کیے بلکہ اپنے قوی ہیکل نوکر کو ہمارے پیچھے لگا دیا۔ وہ تو شکر کرو کہ ہم دونوں کی ریس اچھی ہے ورنہ... آج قبرستان نہیں تو اسپتال میں ضرور پڑے ہوتے آہ! مَیں نے کس خلوص کے ساتھ نذرانۂ دل اُس کے حضور پیش کیا۔ لیکن اُس نے وہی دل پتھر کی طرح میرے منہ پر دے مارا..... اب تم ہی بتاؤ، ان ناسازگار حالات میں میرا پُرانے عشق پر قائم رہنا کہاں تک درست ہے؟۔ جب کہ..... اس میں جسمانی ٹوٹ پھوٹ کا خطرہ بھی ہے ....جیسا کہ غالب نے کہا ہے

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

انیس میری پُر درد تقریر سے بہت متاثر ہوا۔ مَیں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔'' وہ بولا'' نیا عشق گویا نسیم سے بالواسطہ انتقام بھی ہوگا، میرا مطلب ہے کہ..... تُو نہیں اور سہی..... لیکن یار! تُم ہر لڑکی کو دل ہی کیوں دیتے ہو، کچھ اور کیوں نہیں دیتے تمھارا دل بڑا منحوس ہے جہاں جاتا ہے پلٹ کر واپس آ جاتا ہے..... تمھارے اور بھی اعضائے رئیسہ ہیں۔ مثلاً دماغ، جگر پھیپھڑے اور گردے وغیرہ!!''.....

''کیا مطلب ہے تمھارا!؟ مَیں بھنا گیا۔ ''تُم پھر مذاق پر اُتر آئے ہو؟ تُم انسان ہو یا گدھے؟ جمالیاتی حس تو تم سے چھو کر نہیں گزری حالانکہ غور کیا جائے تو... گدھے میں بھی جمالیاتی حس ہوتی ہے!''

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو: گدھے میں بھی جمالیاتی حس ہوتی ہے۔'' وہ بولا'' اور تمھارا عشق بھی بڑی حد تک گدھوں سے مماثلت رکھتا ہے۔ جہاں لڑکی دیکھی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ بس کھٹ سے عاشق ہو گئے.....''

''بس بس!'' میرا پیمانہ صبر و ضبط چھلکنے لگا،'' اب مَیں آگے کچھ نہیں سُن سکتا، صورت کافر دیکھ کے منہ سے آہ نکل ہی جاتی ہے چاہتے کیا ہو، اب کوئی یوں بھی، اللہ کا نام نہ لے؟ مَیں سوچ بھی نہیں سکتا کہ جسے مَیں یارِ وفادار سمجھتا تھا وہ مار آستین نکلے گا۔ اے عاقبت نااندیش آج سے تُو میرے دوستوں کی جماعت سے نکل کر دشمنوں کی صف میں آ گیا ہے۔ مَیں آج ہی تیرا سارا کچا چٹھا تیرے گھر والوں پر کھول کر تجھے زدوکوب کرواؤں گا'' مَیں پھُنکارتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ارے ارے.....'' انیس مجھے کرسی میں دھکیلتا ہوا بولا،'' یار تُم تو سچ مچ آگ بگولہ ہو رہے ہو۔ تمھاری حالت اتنی خراب پہلے تو کبھی نہ تھی۔ لگتا ہے معاملہ واقعی کچھ سیریس ہے۔ اب جب کہ تم شاہزادہ مُنیر شامی بن کر میرے در پر آ ہی گئے ہو تو یہ حاتم ثانی تمھیں خالی نہ لوٹائے گا۔ آیا ہے میرے در پر تو کچھ لے کر جائے گا۔ ویسے بھی میں تمھاری دشمنی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔''

''ہُوں.....'' مَیں نے سکون کا سانس لیا

''تو پھر کرو گے میری مدد اس عشق کو پروان چڑھانے میں؟...''

''سرِ تسلیم خم ہے!'' اُس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر عالم رکوع میں کہا،'' لیکن یار تُم پھر بُرا نہ منا لینا۔ میری رائے ہے اس عشق میں تُم دل نہ دو تمھارا دل سچ مچ منحوس ہے.....''

''تو پھر کیا دوں!؟'' مَیں نے بے چارگی سے کہا،'' نوٹ وغیرہ تو میرے پاس ہیں نہیں!...''

''ارے نوٹوں کو گولی مارو، تُم ...تُم ایسا کرو اس بارواردات عشق میں گُردے کا استعمال کرو..... ویسے تو جگر یا دماغ بھی دے سکتے ہو لیکن طبی نکتۂ نظر سے گُردہ دینا نسبتاً آسان ہے۔ اور یہ کسی قدر دل سے مشابہت بھی رکھتا ہے۔''.....

''گویا تم ایک بار پھر.....!''

''ارے نہیں نہیں!..... بہ خدا مذاق مت سمجھو! مَیں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں''

''پتہ نہیں تُم کیا کہہ رہے!؟'' مَیں نے تنگ آ کر کہا،'' گردہ کیسے دوں؟''

''جیسے دل دیا کرتے ہو!۔ میرا مطلب ہے آئندہ اپنے تذکرۂ عشق میں دل کا ذکر نہ کرنا ہمیشہ یہی کہنا مَیں نے اُسے گردہ دے دیا ہے۔'' ''لیکن اب تُم میری مدد کے لیے کیا طریقۂ کار اپناؤ گے؟''

''کل جب تُم دودھ لینے جاؤ گے تو مَیں بھی تمھارے ساتھ چلوں گا۔ پہلے اُس دوشیزہ کا تفصیلی معائنہ کروں گا۔ پھر اُس کے مزاج کا درجۂ حرارت دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ اگر مَیں نے محسوس کیا کہ اس کے عشق میں تمھارے ڈھانچے کو کسی قسم کا گزند پہنچنے کا خدشہ نہیں تو اُس کے حسب نسب کے بارے میں معلومات اکٹھی کروں گا۔ اس طرح زینہ بہ زینہ منازل عشق طے کرنا ہوگی۔ یاد رکھو! ایک دم چھلانگ لگانے کی کوشش کی تو مُنہ کی کھاؤ گے اور ہڈیاں الگ تڑواؤ گے!''.....

''ٹھیک ہے!'' مَیں نے پُر جوش انداز میں کہا، ''تو پھر.....ڈن؟''

''ڈن!'' اُس نے میرے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہوئے کہا۔ اگلے روز اسکول میں قطعاً دل نہ لگا۔ کئی پیریڈ گزر گئے۔ ٹیچر آئے اور پڑھا کر چلے گئے۔ مگر میری یہ حالت کہ

نہ ابتداء کی خبر ہے نہ انتہا معلوم رہا

یہ وہم کہ ہم ہیں، سو وہ بھی کیا معلوم!

فزکس کا پیریڈ تھا۔ باقر صاحب اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں آواز کے متعلق سمجھا رہے تھے..... ''آواز ایک توانائی ہے..... یہ کام کرتی ہے۔ مثلاً گھنٹی کی آواز کو لیجیے.....''

اور میرے ذہن میں ایک دم وہ مترنم آواز گونج گئی.... ''تین پاؤ دودھ'' واقعی بڑی توانائی تھی اُس آواز میں اُس آواز نے تو غفار باڑے والے کے سنگلاخ چٹانوں جیسے دل میں بھی شگاف ڈال دیا تھا آواز کی توانائی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا تھا۔۔۔۔۔۔۔ ''باقر صاحب تو خوامخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں!' مَیں نے سوچا۔ ''اگر وہ اُسی دوشیزہ کو کلاس میں بُلوا کر اُس کے مُنہ سے تین پاؤ دودھ! کے الفاظ کہلوا دیں۔ کُند ذہن سے کُند ذہن لڑکا بھی آواز کی توانائی کا قائل ہو جائے گا۔''.....

''قادر!'' اچانک باقر صاحب کی کڑک دار آواز نے میرے خیالات کی جھیل میں پتھر دے مارا

''یس سر!'' مَیں گھبرا گیا..... ''تُم کہاں ہو؟''

''باڑے میں'' اور اس کے ساتھ ہی کلاس میں بے شمار قہقہے بلند ہوئے۔ مَیں مزید گھبرا گیا

''نو سر.....نو سر! مَیں ....مَیں یہیں....کلاس میں ہوں!''

''ایڈیٹ! آج تمھارے ہوش کہاں ہیں۔ تم بہ ظاہر کلاس ہی میں ہو، لیکن دماغ کہاں ہے؟ مَیں دیکھ رہا ہوں۔ تُم نے اتنی دیر سے ایک لفظ نہیں سنا!''

''نو سر! میں نے ساری باتیں سُن لی ہیں!''

''کیسی باتیں؟.....

''وہی جو آپ نے آواز کے متعلق بیان کی ہیں!''

''اچھا!؟.....تو ثابت کرو کہ آواز ایک توانائی ہے.....یہ کام کرتی ہے!''

''سر! اس حقیقت میں کسی شک شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ آواز ایک توانائی ہے۔آوازیں دو قسم کی ہوتی ہیں.....''سُریلی'' اور بے سُری''۔سُریلی آواز دل پر اثر انداز ہوتی ہے جب کہ بے سُری آواز سے کانوں کے پردے پھٹنے کا احتمال رہتا ہے۔تیز اور ہلکی فریکوینسی کے حسین امتزاج سے سُریلی آواز پیدا ہوتی ہے جیٹ جہاز جب نیچی پرواز پر ہوتے ہیں تو کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ جاتے ہیں،اسی طرح ہمارے ہاں کا ایک گلوکار جب ایک پکے راگ کا الاپ کر رہا تھا تو میز پر رکھا ہوا گلاس تھرتھرا کر ٹوٹ گیا۔پس ثابت ہوا کہ جیٹ جہاز کی آواز اور اُس گلوکار کی آواز میں کوئی خاص فرق نہیں۔دونوں نے شیشے توڑے سر! یہ دو ٹھوس دلائل اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ آواز ایک توانائی ہے جو ہر قسم کے شیشے توڑنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔مثلاً برتنوں کے شیشے،کھڑکیوں کے شیشے اور دل کے شیشے وغیرہ.....''میں روانی میں بولتا چلا گیا۔

باقر صاحب کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔نہ جانے وہ بھی تمام لڑکوں کی طرح ہنسی ضبط کر رہے تھے یا غصہ پی رہے تھے لیکن اس سے قبل کہ وہ اپنی اندرونی کیفیات کا اظہار برملا کرتے پیریڈ ختم ہو گیا اور وہ پیر پٹختے ہوئے کلاس سے باہر چلے گئے۔اردو کا پیریڈ شروع ہوا۔حامد علی خان صاحب تشریف لائے اُن کا پیریڈ تو یوں بھی ہنگامہ خیز رہتا۔وہ جوں ہی میر کی غزل کا کوئی شعر بہ غرض تشریح پڑھتے پوری کلاس سے ''واہ واہ'' کا غلغلہ داد و تحسین بلند ہوتا اور وہ اُچھل کر کھڑے ہو جاتے۔اُن کے ہاتھ میں ہمیشہ کسی درخت کی پتلی سی تازہ شاخ رہتی۔وہ کلاس میں گشت کرتے ہوئے اعلان فرماتے۔''بس! اب ہمارا مارنے کا موڈ ہو گیا ہے!''لڑکے سہم کر چُپ ہو جاتے۔پھر اچانک وہ نرم و نازک شاخ کسی لڑکے کی گدی پر پڑتی۔لڑکا ہڑبڑا کر گدی مسلتے ہوئے حامد صاحب کو احتجاجی نظروں سے دیکھتا تو ارشاد ہوتا،۔''ہمارا مارنے کا موڈ ہو گیا ہے!''.....اُس دن بھی ایسے ہی ناموافق حالات میں کسی شعر کی تشریح میں اُلجھ گئے۔اُن کا شعر سمجھانے کا انداز بھی الگ ہی تھا۔کبھی تو یوں لگتا ریڈیو پر مقامی خبریں ہو رہی ہیں،کبھی کسی شعلہ بیاں مقرر کی طرح پُر جوش تقریر شروع کر دیتے۔اور اس تقریر کے دوران عام واعظوں کی طرح پٹڑی سے اُتر کر ٹہلتے ٹہلتے کبھی مشرق کی طرف جا نکلتے اور پھر وہاں سے دوڑ کر واپس مغرب میں آ جاتے۔اس دن جو بھٹکے تو سلطنتِ مغلیہ کی حدود میں جا نکلے اور کسی مغل شہزادی کا قصہ لے بیٹھے۔جو اُن کے بہ قول چندے آفتاب چندے ماہتاب ہونے کے علاوہ سخن فہمی اور شعر گوئی میں بھی اپنا ثانی نہ رکھتی تھی۔شہزادی کے والد ظل سبحانی کو لحظہ لحظہ یہ غم کھائے جا رہا تھا۔کہ اُن کی جواں سال بیٹی کے حسن کو شاعری کا بھوت نگل رہا ہے۔اُسے شاعری اور صرف شاعری سے عشق تھا۔وہ کسی سے شادی کر کے اپنے اس عشق کے حصے بخرے کرنے کو تیار نہ تھی.....لیکن جب بوڑھے باپ نے منت سماجت کی انتہا کر دی تو اُس الف لیلوی شہزادی نے ایک شرط پیش کی کہ ''اگر شادی ناگزیر ہے تو پھر اُس شخص سے ہو گی جو ہمارے دیے ہوئے ''مصرعہ طرح'' پر انتہائی مناسب گرہ لگائے گا۔مصرعہ تھا ''پھول مرجھا گئے رات بس کے''.....سینکڑوں شاعر اور انسان آئے اور حسبِ توفیق گرہ لگا کر چلے گئے۔لیکن نک چڑی شہزادی ہر مصرعے پر ناک بھوں چڑھاتی رہی آخر ایک دن ایک شخص کہ دیکھنے میں گداگر لگتا تھا۔محل میں آیا اُس کی شکل ہی سے عیاں تھا کہ وہ کئی روز

سے بھوکوں مر رہا ہے۔ پیٹ کی خاطر انسان سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اُس نے کہا ''ہم مصرعے پر عمدہ گرہ لگانے کی صلاحیت رکھتے ہیں'' شہزادی نے چلمن کی اوٹ سے مصرعہ پڑھا ''پھول مُرجھا گئے رات بس کے''

فقیر نے برجستہ کہا، ع ''شبنم گری ترس ترس کے''

اب یہ مصرعہ وزن میں ہے یا نہیں یہ تو شہزادی صاحبہ جانیں یا وہ فقیر۔ لیکن شہزادی صاحبہ کو مصرعہ ایسا پسند آیا کہ وہ آپے سے باہر ہو گئیں۔ فوراً چلمن توڑ کر فقیر سے لپٹ گئیں..... اور وہ بھوکا فقیر.... ایسا نہال ہوا کہ مارے خوشی کے وہیں مر گیا۔ اس مختصر کہانی کا انجام کسی لڑکے کو پسند نہ آیا۔ سب کو فقیر سے گہری ہمدردی ہو گئی تھی۔

''سر! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی!'' شکیل کھڑا ہوا ''آخر فقیر مر کیوں گیا؟''

''شہزادی کی اس واہیات حرکت پر شرم سے مر گیا ہو گا!'' کہیں سے آواز آئی۔

''سر مَیں بتاؤں!'' مَیں نے جلدی سے کہا۔

''ہاں تم بتاؤ'' حامد صاحب بولے۔

''بات یہ ہے سر! ابھی فزکس کے پیریڈ میں باقر صاحب توانائی کی بہت سی اقسام بتا کر گئے ہیں۔ لیکن انھوں نے ایک توانائی کا ذکر نہیں کیا۔ وہ ہے عشق کی توانائی۔ سر! یہ میرا ذاتی تجربہ ہے بلکہ کئی بار آپ نے خود سمجھایا ہے کہ عشق میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ مجھے علامہ اقبال کا ایک مصرعہ بھی یاد آ رہا ہے ع قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے۔ تو سر! عشق میں بڑی توانائی ہے۔ بڑی قوت ہے! میرا خیال ہے شہزادی صاحبہ کو فقیر کے برجستہ مصرعے نے پھڑکا دیا ہو گا۔ وہ بے اختیار اُس پر عاشق ہو گئی ہوں گی۔ کیوں کہ بہ قول غالب عشق پر زور نہیں۔ فقیر بے چارہ تو پہلے ہی کئی روز کا بھوکا تھا۔ شہزادی نے مکمل قوت عشق کے ساتھ اُسے بھینچا اُس کی تو ہڈیاں کڑکڑا گئی ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ موقع ہی پر ہلاک ہو گیا۔''

''واہ واہ! واہ واہ!'' کلاس میں میری پُر مغز وضاحت پر غُلغلہ ہوا اُس کے بعد وہی ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھے۔ حامد علی خاں صاحب نے اُچھل کر اعلان فرمایا ''ہمارا مارنے کا موڈ ہو گیا ہے'' اور دوسرے ہی لمحے ہری بھری شاخ ''شڑاپ شڑاپ'' مجھ پر برسنے لگی۔ لیکن اس عالمِ تشدد میں بھی مَیں سوچ رہا تھا.....

اے دل تیری آہوں میں اثر ہے کہ نہیں ہے جو حال اِدھر ہے وہ اُدھر ہے کہ نہیں ہے؟

شام کو اُس شوخ کا دیدارِ ثانی نصیب ہوا۔ آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو قرار ملا۔ مَیں نے دیکھا کہ اک مَیں ہی کُشتۂ تیغِ نظر نہ تھا۔ باڑے میں کھڑا ہر شخص اُسے گھور رہا تھا۔ اور زیرِ لب ٹھنڈی آہیں بھر رہا تھا

الٰہی کیا کیا تُو نے کہ عالم میں تلاطم ہے
غضب کی ایک مُشتِ خاک زیرِ آسماں رکھ دی

خود انیس حواس باختہ تھا۔ تب اچانک میرے دل میں ایک روح فرسا خیال نے انگڑائی لی۔ کہیں یہ سب لوگ میرے رقیبانِ روسیاہ تو

نہیں بننے والے؟ آہ تو کیا میرا معصوم عشق ابتدائی مراحل ہی میں فوت ہو جائے گا؟ مَیں نحیف و نزار اتنے سارے رقیبانِ روسیاہ کا مقابلہ کیسے کروں گا اور یہ انیس کیسے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس کی نیت میں فتور آ رہا ہے۔ کہیں یہ مجھے ڈبل کراس کرنے کی تو نہیں سوچ رہا۔

''ابے او!'' مَیں نے اچانک انیس کو جھنجوڑا....

''کیا ہے؟ کیا ہے؟'' وہ بوکھلا گیا۔

''بیٹا! یاد رکھ یہ میری امانت ہے! اگر خود عاشق ہونے کی کوشش کی تو ہڈی پسلی ایک کر دوں گا!'' مَیں نے دانت پیس کر کہا۔

''نہیں یار! کیسی باتیں کرتے ہو۔ مَیں تو پہلے آؤ پہلے پاؤ کا قائل ہوں ویسے یار! آج مجھے مقدر کا بھی قائل ہونا پڑ رہا ہے۔ اب اسے تمھارا مقدر ہی کہا جا سکتا ہے کہ ایسا حسین چہرہ عاشق ہونے کے لیے تمھیں دستیاب ہوا۔ لیکن سب کے مقدر تمھارے جیسے کہاں! مثلاً اسی حسینہ کو دیکھو! اسے تم جیسا بونگا عاشق ملا۔ کاش تم سے پہلے اسے مَیں نے دیکھا ہوتا''۔

''تو کہنا کیا چاہتا ہے!'' میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ''مجھے تیری نیت پر شُبہ ہونے لگا ہے!'' میری آواز قدرے بلند ہو گئی۔ سب کی نظریں ہماری طرف اُٹھ گئیں معہ اُس پری وش کے۔'

'تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟'' انیس دانت پیستے ہوئے بڑبڑایا۔ ''سب ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ ہٹو وہ جا رہی ہے۔ مَیں اُس کے پیچھے جاؤں گا۔ تم گھر پر میرا انتظار کرو، شام کو رپورٹ پیش کروں گا۔''

انیس کسی ماہر جاسوس کی طرح اُس کے پیچھے روانہ ہو گیا اور مَیں دل کی بے قابو دھڑکنوں کو قابو میں لانے کی سعیٔ ناکام کرتا ہوا دست بہ دعا ہو گیا۔ ''الٰہی! کہیں انیس بے ایمان نہ ہو جائے..... کہیں..... کہیں امانت میں خیانت کا گناہ گار ہو کر اپنی عاقبت ہی خراب نہ کر بیٹھے..... اللہ سب کا ایمان سلامت رکھنا! آمین''

دو دن تک انیس کی شکل نہ دکھائی دی۔ مَیں کسی ماہیٔ بے آب کی طرح اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ دل میں بے شمار منفی خیالات، اندیشے اور وسوسے سر اُٹھا رہے تھے، غالب کا یہ شعر بار بار ذہن میں گھوم رہا تھا۔

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

''تو کیا انیس؟..... نہیں نہیں..... ایسا نہیں ہو سکتا..... وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا.. وہ لاکھ کمینہ سہی... لیکن ہے تو میرا لنگوٹیا..... وہ میری امانت میں خیانت کی جرأت نہیں کر سکتا..... وہ..... وہ اپنی موت کو دعوت کیسے دے سکتا ہے... الٰہی..... الٰہی..... اُف! مَیں کیا کروں۔''

تیسرے دن دوپہر کو جب سوچ سوچ کر میرا دماغ آتش فشاں بن چُکا تھا۔ اچانک اُس منحوس کی شکل دکھائی دی..... مَیں دوڑ کر اُس کے قریب پہنچا۔ اور اُسے بُری طرح جھنجھوڑتے ہوئے اُس پر سوالات کی بارش کر دی،۔ ''کہاں تھا تو؟ دو دن..... دو دن سے؟ تُو نے تو اُسی شام رپورٹ پیش کرنے کو کہا تھا..... پھر..... پھر یہ اتنا لمبا انتظار؟..... تجھے میری حالت کا کچھ اندازہ بھی ہے..... کوئی جان سے بھی جا سکتا تھا..... مگر تمھیں کیا

؟.....تُم کوئی دوست ہو؟ تم تو....تم تو آستین کے سانپ ہو.....تمھاری بلا سے .کوئی جیے یا مرے....تم وہ ہو جس کے بارے میں کنفیوشس سے کہا ہے.....''

''ابے ہٹ! آگے سے'' انیس مجھے دھکا دیتے ہوئے بولا ''بیٹھنے تو دے! اور بھی غم ہیں زمانے میں عشق و عاشقی کے سوا''.....

''عشق و عاشقی نہیں!'' مَیں نے غصے سے کہا ''محبت کے سوا'' اور تیرا مطلب کیا ہے؟ یعنی اتنے دن بعد اپنی منحوس شکل دکھائی.....پھر بھی خالی ہاتھ آیا ہے؟ میری محبت کے لیے کچھ نہیں کر سکا!؟''

''یار! سانس تو لینے دے! تیرا کام تو اُسی دن ہو گیا تھا.....''

''اچھا!'' میری باچھیں کھل گئیں۔ میرے دماغ کے آتش فشاں پر اُس کے اس ایک جملے نے ڈھیروں پانی ڈال دیا۔ ''پھر دو دن کہاں غائب رہا؟''

''یار کیا بتاؤں۔ اُسی شام میری ایک دُور کی خالہ ٹنڈو آدم سے تشریف لے آئی تھیں۔ میری امی کو یہ خالہ قطعاً اچھی نہیں لگتیں۔ حالانکہ اُن کے نقوش اس عمر میں بھی خاصے تیکھے ہیں.....سُنا ہے شادی سے پہلے میرے ابا اُن پر عاشق تھے اسی لیے امی کی ضد تھی کہ اُنھیں فوراً واپس ٹنڈو آدم چھوڑ کر آؤں۔ مَیں نے لاکھ بہانے بنائے لیکن امی نہ مانیں سو اگلی صبح مجھے خالہ کے ساتھ ٹنڈو آدم جانا پڑا....ویسے میں تمھیں بتاؤں! یہ جو میری خالہ ہے نا! یہ میرے ابا کی پھوپھی کی بیٹی ہیں. یعنی میرے ابا کی کزن. دونوں کا بچپن ایک ہی آنگن میں کھیلتے ہوئے گزرا۔ اصل میں ہُوا یہ کہ ابا کے پھوپھا کی وفات کے بعد ابا کی پھوپھی میرے ابا کے دادا۔ یعنی میرے پردادا کے گھر رہنے گئیں جو کہ اتفاق سے اُس کزن کے بھی دادا تھے اسی گھر میں اتفاق سے۔ ابا کی ایک اور کزن بھی رہتی تھی جو کہ اُس کزن کی بھی کزن تھی یعنی اُس کزن کے ماموں کی بیٹی تھی وہ جو اُس کزن کے ماموں تھے نا! وہ میرے ابو کے چچا تھے.....اب ہوا کہ ابا اپنی پھوپھی کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن دادا چاہتے تھے وہ چچا کی بیٹی سے.....

''جہنم میں گئی تیرے ابو کی چچا کی بیٹی.....'' مَیں نے جل کر کہا۔

''اوئے اوئے! مُنہ سنبھال کر بات کر!'' انیس اچانک طیش میں آ گیا ''وہ ابا کے چچا کی بیٹی...میری امی ہے!''

''اوہ!'' مَیں گڑبڑا گیا ''معاف کرنا یار! تُو نے اپنی خاندانی وارداتِ عشق، کچھ ایسے اُلجھے ہوئے انداز میں بیان کی ہے کہ مَیں رشتوں کی بُھول بُھلیوں میں اُلجھ کر رہ گیا.....مَیں....مَیں تہِ دل سے معذرت خواہ ہوں۔ تُم تو جانتے ہو۔ تمھاری امی کے لیے میرے دل میں کیسے جذبات ہیں اُن کی تو آواز ہی سے میری روح فنا ہو جاتی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جس طرح مَیں تمھاری امی کا احترام کرتا ہوں۔ تمھارے ابو بھی اسی طرح کرتے ہوں گے لیکن.....لیکن.....میرے عزیز دوست تم خود ہی سوچو..تمھارے اس موروثی قصۂ عشق میں مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے...تم زبردستی مجھے کیوں سنانے پر تُلے ہوئے ہو۔ خدا کے لیے۔۔۔خدا کے لیے.....مجھے بتاؤ....میرے عشق کے سلسلے میں تم نے کیا کیا ہے؟''

انیس کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا، ''اُس کا نام نگار ہے!''

''کس کا؟'' مَیں نے معصومیت سے پوچھا۔ ''تمھارے ابا کی پھوپھی زاد کا؟''

''ابے نہیں!'' وہ جھنجھلا کر بولا ''اُس پری جمال کا! جس کے عشق میں تو نے اس دفعہ دل نہیں.... گُردے کا استعمال کیا ہے۔''

''نگار!'' مَیں نے آہستہ سے دہرایا، ''کیسا حسین نام ہے!''

مَیں خیالات کی حسین وادیوں میں گُم ہو گیا۔ ہر طرف کلیاں چٹکنے لگیں۔ پھول کھلنے لگے۔ فضائیں گنگنانے لگیں۔ پرندے چہچہانے لگے۔ میری ساری دنیا رنگ و نکہت میں ڈوب گئی۔ ''انیس! تُو نگار کا مطلب جانتا ہے؟ مَیں یوں بولا جیسے خود کلامی کر رہا ہوں

''ہاں!.....شاید اخباری رپورٹر کو کہتے ہیں!'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''کیا؟....'' مَیں خیالات کی وادیوں سے ایک بار پھر واپس اپنے ڈرائنگ روم میں آ گرا۔ ''یہ نگار کا مطلب تجھے اخباری رپورٹر کس نے بتایا؟''

''بتاتا کون! مَیں نے خود اخبار میں پڑھا ہے۔ کسی خبر کے شروع ہونے سے پہلے بریکٹ میں ''نامہ نگار'' لکھا ہوتا ہے۔ پہلے پہل تو میں سمجھا کہ یہ کسی اخباری رپورٹر کا نام ہے۔ لیکن جب ہر اخبار میں کسی نہ کسی خبر کے ساتھ ''نامہ نگار'' لکھا نظر آیا تو سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ اخباری رپورٹر ہی کو کہتے ہیں!'' انیس نے قدرے فخر سے کہا۔

''ابے جاہل! وہ نامہ نگار ہوتا ہے۔ یہ صرف نگار ہے... نگار!''

''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے'' وہ بولا، ''میرا نام بھی تو انیس الرحمان ہے لیکن لوگ مجھے صرف انیس کہتے ہیں۔''

''ابے گدھے! نگار تصویر کو کہتے ہیں!''

''اچھا!؟ انیس حیرت سے بولا ''کمال ہے!''

''اچھا چھوڑ و اس قصے کو! ''تم حفیظ جالندھری کو جانتے ہو نا؟''

''کون؟ یہ جالندھر فرنیچر والے؟''۔

''لاحول ولا قوۃ!'' مَیں نے غصّے سے کہا، ''ابے وہ نہیں! وہ جو ابوالاثر ہیں!''

''کون ابوالاثر!؟ میرے کسی دوست کا نام اثر نہیں۔ اور نہ مَیں کسی اثر کے باپ کو جانتا ہوں۔''

میرا جی چاہا کہ میز پر پڑا ہوا گلدان اُٹھا کر اُس کے سر پر دے ماروں..... ''اَبے! مَیں ابوالا ثر حفیظ جالندھری کی بات کر رہا ہوں۔ جنھوں نے ہمارا قومی ترانہ لکھا ہے...''

''اوہ!'' انیس ہونٹ سکیڑ کر بولا، ''وہ شاعر! لیکن وہ تو حفیظ تخلص کرتے ہیں۔ یہ ابوالاثر کیا ہے؟'' پھر توقف کے بعد بولا، ''اچھا اچھا کُنیت ہے! دیکھو یار! انسان کی عمر جتنی بھی ہو فیشن سے باز نہیں آتا۔ رہنے والے ہیں جالندھر کے اور نقل کرتے ہیں عربوں کی۔ یہ کنیت رکھنا تو عربوں کا رواج ہے نا؟''

''پتا نہیں تُو کیا بکواس کر رہا ہے!'' مَیں نے جل کر کہا۔

''اوئے!'' اچانک انیس چونک کر بولا، ''یہ تیری وارداتِ عشق میں حفیظ جالندھری کہاں سے آ گئے؟''

''وہ!'' مَیں ایک بار پھر عشق کی وادیوں میں لوٹ آیا، ''وہ تو نے بتایا نا! کہ اُس کا نام نگار ہے تو مجھے جالندھری کی مشہور نظم کے کچھ مصرعے یاد آ گئے۔ وہ کہتے ہیں

نگار ہائے قفنہ گر کوئی ادھر کوئی اُدھر
اُبھارتے ہیں عیش پر تو کیا کرے کوئی بشر
چلو جی قصہ مختصر تمھارا نکتۂ نظر
درست ہو تو ہو مگر، ابھی تو میں جوان ہوں

''واہ واہ!'' انیس نے یوں داد دی جیسے مصرعے واقعی اُس کی سمجھ میں آ گئے ہوں۔

پھر بولا، ''یہ جو تم ہر روز نیا عشق کرنے لگے ہو۔ اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم واقعی جوان ہو گئے ہو۔ لیکن یار! ایک مسئلہ ہے اس عشق میں مزید سیریس ہونے سے پہلے تمھارا ایک شخص سے ملنا بہت ضروری ہے۔ چلو میرے ساتھ..''

اور پھر وہ مجھے تقریباً گھسیٹتا ہوا گھر سے باہر لے آیا.... مَیں بار بار پوچھتا کس سے ملوا رہے ہو؟۔ وہ یہی جواب دیتا۔ ''ابھی پتا چلتا ہے!''

....ہم محلے کی دس بارہ گلیاں عبور کر کے ایک دور افتادہ گلی میں پہنچے تو انیس ٹھٹک کر رُک گیا اور آہستہ سے بولا،

''اس سامنے کھڑے شخص کو دیکھو!''

مَیں نے دیکھا ہم سے کچھ دُور ایک دُبلا پتلا لمبا سا آدمی کھڑا تھا۔ آنکھوں کے سوا اُس کی ہر شے لمبی تھی۔ کان لمبے، ناک لمبی، بازو لمبے، ہاتھ لمبے، ٹانگیں لمبی اور پاؤں بھی لمبے اُس کے چہرے پر تنی مونچھیں، ناجائز تجاوزات کے زُمرے میں آتی تھیں اُس نے مونچھوں میں ڈاڑھی کی آمیزش کے ساتھ چہرے کے دونوں جانب خنجر نما چیزیں بنا رکھی تھیں۔ اُسکا دہانہ گھنی مونچوں میں کہیں غائب ہو گیا تھا۔ دُور سے وہ کسی انسان کی بجائے صلیب کا نشان دکھائی دیتا تھا۔

''یہ کون ہے؟'' مَیں نے پوچھا۔

''تیرے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ!'' انیس نے جواب دیا۔

''نہیں!'' مَیں نے بے یقینی سے کہا، ''یہ.....اور میرا رقیب روسیاہ؟....کہاں وہ نوخیز کلی.....کہاں یہ بوڑھا کھوسٹ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے اور حرکتیں؟...معاذ اللہ'' میرا خون کھولنے لگا۔ یہ بوڑھے بھی نا!.....مرنے کا نام ہی نہیں لیتے یہ لوگ بھی کیا لوگ ہیں مر کیوں نہیں جاتے.... جب انھی کے عشق ختم نہیں ہوتے تو ہم نوجوان کہاں جائیں.... یہ سراسر زیادتی ہے۔ جوانوں کی حق تلفی ہے۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔

''انیس!'' تم دیکھو! اس نے جو یہ موٹر سائیکل کے ہینڈل جیسی مونچھیں رکھی ہیں نا! مَیں انھیں مونچھوں سے پکڑ کر اسے گھماؤں گا اور پھر

سامنے والی دیوار سے دے ماروں گا!

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

انیس مجھے روکنے کی کوشش کرتا رہا اور مَیں اُسے گھسیٹتا ہوا اُس بوڑھے کی طرف بڑھتا گیا۔ میرے ذہن میں جذبۂ انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

انیس بار بار کہہ رہا تھا، ''ابے یہ وہ نہیں جو تو سمجھ رہا ہے''۔

لیکن میں کچھ سننے، سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں سے عاری ہو چکا تھا۔ اُس عجیب و غریب شخص کے قریب پہنچ کر مَیں نے اپنی آواز کو حتی المقدر کرخت بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا،

''کیوں بڈھے! تجھے شرم نہیں آتی؟ اپنی عمر دیکھ اور حرکتیں دیکھ۔ تیرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ تو....''

اچانک انیس نے میرے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا اور خود بوڑھے سے مخاطب ہو کر بولا'' دورہ پڑ گیا ہے۔ دورہ پڑ گیا ہے چاچا۔ یہ بیمار ہے۔ اسے اسی طرح دورہ پڑ جاتا ہے'' وہ مجھے کھینچ کر بوڑھے سے دور لے گیا۔ پھر اچانک عجیب و غریب، خوفناک اور گرجدار آوازیں آنے لگیں جو کوشش کے باوجود سمجھ میں نہ آ سکیں۔

''یہ کیسی آوازیں ہیں؟'' مَیں نے انیس سے سرگوشی کی....

''یہی بول رہا ہے!''۔

''اچھا!'' مَیں نے حیرت سے کہا'' مگر یہ بول کہاں سے رہا ہے؟''.....

''مونچھوں کے پیچھے سے!''۔

''مگر تُو مجھے پیچھے کیوں گھسیٹ لایا ہے؟ دیکھ آج مَیں اس بوڑھے کا کیا حشر کرتا ہوں! یہ ہوتا کون ہے؟''

عین اُسی لمحے قریب کے دروازے کا پردہ ہٹا اور اُس حسینہ کا چہرہ یوں نمودار ہوا جیسے جھیل کے گدلے پانی میں سے کنول نمودار ہو وہ کہہ رہی تھی ''ابا! یہی ہے وہ جو باڑے میں مجھے دیکھ دیکھ کر مسکراتا ہے'' اُس کے ساتھ ہی اُس صلیب نما انسان نے روبوٹ کے انداز میں میری طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

انیس مجھے کھینچتا ہوا چیخا، ''بھاگ!!!''

مگر اس سے پہلے کہ معاملات پوری طرح میری سمجھ میں آتے۔ اُس صلیب کے پہلو سے ایک لکڑی نما چیز ہوا میں بلند ہو کر میرے سر پر آ پڑی۔ کچھ دیر کے لیے میری دنیا تاریک ہو گئی۔ اور پھر اچانک جیسے میرے پیروں میں تیز رفتار پہیے لگ گئے۔ مَیں ہوا سے باتیں کرنے لگا کافی دیر محوِ پرواز رہنے کے بعد جب میں کسی تھکے ہارے پرندے کی طرف زمین پر آ گرا تو سانسیں بحال ہونے پر خود کو ایک پبلک پارک میں پایا۔ قریب ہی

انیس کو پڑا پایا۔ اُس کا سینہ بھی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور کہہ رہا تھا، ''خدا کا شکر ہے! مَیں تو صاف بچ گیا!''

''تُو نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ وہ اُس کا باپ تھا!؟'' مَیں نے انیس سے احتجاج کیا۔

''بتا تو رہا تھا!'' انیس غصّے سے بولا۔ ''مگر تو سننے کو تیار ہی کب تھا، تیرے اندر تو کسی پُرانے افلاطونی بلکہ دقیانوسی عاشق کی روح حلول کر گئی تھی!''

مَیں نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اُس پر آلو کے برابر گومڑ نکلا ہوا تھا۔ میرا جی رونے کو چاہ رہا تھا۔ اُس اَن ہونی ہاتھ نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں تک چھین لی تھیں۔ کوئی درد بھرا فلمی گیت بھی یاد نہیں آ رہا تھا اچانک انیس نے اپنی کہنی میرے پہلو میں دے ماری۔ مَیں ''اُف'' کی آواز کے ساتھ احتجاجاً اُس پر حملہ آور ہونے ہی کو تھا کہ اُس نے بھنویں اُچکا کر ایک طرف دیکھنے کو کہا۔ مَیں نے اُس طرف دیکھا اور پھر..... اچانک میری یادداشت بحال ہوگئی۔ مجھے بہت سے شعر ایک دم یاد آ گئے۔ میری عشقیہ صلاحیتیں از سرِ نو بیدار ہو گئیں۔

''یار انیس!'' مَیں نے آہستہ سے کہا ''یہ قتّالۂ عالم، دلُربا، سرو قد، غنچہ دہن، سیمیں بدن، رشکِ چمن، عشوہ طراز، گلعذار تو اُس سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ ہائے ہائے حفیظ جالندھری کیا اچھے آدمی ہیں کیا اچھا فرمایا۔ نگار ہائے فتنہ گر کوئی اِدھر کوئی اُدھر''۔

انیس کہہ رہا تھا تیرا اس صدی میں سدھرنے کا کوئی امکان نہیں! لیکن مَیں تیری دوستی سے تائب ہونے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں''

☆☆☆☆☆

ختم شد

☆☆☆☆☆

کتاب گھر کا پیغام

آپ تک بہترین اردو کتابیں پہنچانے کے لیے، ہمیں آپ ہی کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم کتاب گھر کو اردو کی سب سے بڑی لائبریری بنانا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لیے ہمیں بہت ساری کتابیں کمپوز کروانا پڑیں گی اور اسکے لیے مالی وسائل درکار ہوں گے۔ اگر آپ ہماری براہ راست مدد کرنا چاہیں تو ہم سے kitaab_ghar@yahoo.com پر رابطہ کریں۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو کتاب گھر پر موجود ADs کے ذریعے ہمارے سپانسرز ویب سائٹس کو وزٹ کیجئے، آپکی یہی مدد کافی ہوگی۔

یاد رہے، کتاب گھر کو صرف آپ بہتر بنا سکتے ہیں۔